ذوالقعدہ ۱۴۳۲ھ۔محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۱ء

# سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن

پر مشتمل

# بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

**حصّہ اول** سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

صفحات: 360، قیمت 450 روپے (پانچواں ایڈیشن)

**حصّہ دوم** سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

صفحات 321، قیمت 400 روپے

**حصّہ سوم** سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ

صفحات 331، قیمت 400 روپے

عمدہ طباعت ❁ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ❁ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

**انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور**

A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

**مکتبہ خُدّام القرآن لاہور**

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ ۲۶۹)

# سہ ماہی حکمت قرآن لاہور


جلد ۳۰ — شمارہ ۴

ذوالقعدہ ۱۴۳۲ھ۔محرم الحرام ۱۴۳۳ھ — اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۱ء



بیادگار:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
حافظ محمد زبیر۔ حافظ نذیر احمد ہاشمی
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ



یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون: 200 روپے، فی شمارہ: 50 روپے

# اس شمارے میں


**حرفِ اوّل**

| | | |
|---|---|---|
| اقامتِ دین کی جدوجہد کیوں ضروری ہے...؟ | حافظ عاطف وحید | 3 |

**مضامین قرآن**

| | | |
|---|---|---|
| قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ | ڈاکٹر اسرار احمدؒ | 5 |

**فہمُ القرآن**

| | | |
|---|---|---|
| ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح | افادات حافظ احمد یارؒ | 14 |

**حکمتِ نبویؐ**

| | | |
|---|---|---|
| بار بار گناہ اور بار بار استغفار کرنے والے | پروفیسر محمد یونس جنجوعہ | 24 |

**دعوت و تحریک**

| | | |
|---|---|---|
| ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ناقدانہ اور معتدل طرزِ فکر کا ایک مطالعہ | محمد عمار خان ناصر | 27 |

**فکر و نظر**

| | | |
|---|---|---|
| 'وہم' سے 'علم' تک | حافظ محمد زبیر | 37 |

**جمع و تدوین حدیث**

| | | |
|---|---|---|
| مصنف ابن ابی شیبہ | حافظ حامد حماد | 65 |

**کتاب نما**

| | | |
|---|---|---|
| تعارف وتبصرہ | پروفیسر محمد یونس جنجوعہ | 80 |

**دین و مذہب**

| | | |
|---|---|---|
| ISLAM : DEEN, NOT RELIGION | Dr. Ahmad Afzaal | 86 |

**بیان القرآن**

| | | |
|---|---|---|
| MESSAGE OF THE QURAN | Dr. Israr Ahmad | 96 |

# حرفِ اوّل

## اقامتِ دین کی جدّوجُہد کیوں ضروری ہے...؟

دین اسلام کی بنیاد پر اخروی فوز وفلاح کے لیے دو باتیں ضروری ہے۔ایک یہ کہ آپ کا تصورِ دین صحیح ہو اور دوسرا اس تصورِ دین پر عمل کرنے کا طریق کار نبوی ہو۔اہل علم کی اصطلاح میں مقدم الذکر کو عقیدہ جبکہ مؤخر الذکر کو منہج کہا جاتا ہے۔اگر کسی شخص کے عقیدہ یا تصورِ دین میں کہیں نقص یا کجی ہوگی تو کتاب وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں اس کی اخروی نجات کی خواہش ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ہر دور میں علماء وفقہاء دین اسلام کے خالص تصورات پر پڑنے والے حجابات کو رفع کرنے کی کوششیں کرتے رہے تاکہ خلقِ خدا کے سامنے دین اسلام کا صحیح تصور ہر دور اور ہر حال میں روزِ روشن کی طرح عیاں رہے۔حق پرست اہلِ علم نے جہاں صحیح تصورِ دین کی حفاظت اور فروغ میں اپنی زندگیاں کھپائیں' وہیں انہوں نے اسلامی معاشروں میں دین کے نفاذ واجرا کے لیے بھی ہر دور میں اپنی خدمات پیش کیں' اور اپنے زمان ومکان اور حالات ومقتضیات کی روشنی میں عوام الناس کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی اقوام کے پوری دنیا پر سائنسی اور سیاسی غلبے نے جہاں دوسرے مذاہب اور ملکوں کے حدودِ اربعہ کو متاثر کیا' وہیں مسلمان معاشروں پر بھی اپنے افکار ونظریات اور تہذیب وتمدن کے گہرے اثرات مرتب کیے۔سلطنت عثمانیہ کے زوال اور مغربی اقوام کے ہاتھوں اکثر مسلمان ممالک کے سیاسی طور پر مغلوب ہو جانے کے باعث مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کا کل تصورِ دین بس ذاتی عبادت واصلاح نفس تک محدود ہو کر رہ گیا۔اگر کہیں سے معاشرے کی اصلاح کی آواز لگائی گئی تو وہ بھی اکثر وبیشتر اصلاحِ عقائد ورسوم یا دعوت وتبلیغ کے میدان تک محدود رہی' اور حکومت وریاست' قانون' معیشت وسیاست کی اصلاح کا تصور' دین سے (الا ماشاء اللہ) خارج قرار پایا۔ایسے میں اللہ تعالیٰ نے علامہ محمد اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد رحمہم اللہ جیسی شخصیات کا انتخاب فرمایا کہ جنہوں نے دین کے انفرادی واجتماعی تصورات کو خوب اچھی طرح واضح کیا اور دین اسلام کو ایک ایسے مکمل ضابطہ حیات کی صورت میں متعارف کروایا کہ جس میں زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبے کے لیے رہنمائی موجود ہے۔

کبھی وقت تھا کہ دین کے اس جامع تصور کو بدعت سے کم درجہ نہیں دیا جا رہا تھا اور مسلمان معاشروں کے بہترین دماغ اس تصورِ دین کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور اس پر نقد کر رہے تھے...' لیکن آج یہ تصور بفضل اللہ تعالیٰ گاؤں گاؤں اور بستی بستی عام ہو چکا ہے۔آج ہر خاص وعام کی زبان پر یہ کلمات جاری ہیں کہ دین اسلام صرف مسجد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ کار اور اختیار واقتدار پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ پر بھی قائم ودائم ہے' اور ہونا چاہیے۔

اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اقامتِ دین اور اس کی فرضیت کی بھی فرد اور اجتماعیت کے اعتبار سے دو سطحیں ہیں۔ انفرادی سطح یہ ہے کہ ہر کلمہ گو اپنی ذات پر دین قائم کرنے کی مقدور بھر کوشش کرے اور اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے اسے اللہ کی اطاعت میں دے دے —— یہ عینی طور پر فرض ہے۔ظاہر ہے کہ اسے یہ کام خود کرنا ہے اور کسی دوسرے کے کرنے سے خود اُس فرد سے اس کا مطالبہ ختم نہیں ہو سکتا۔اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔البتہ ایک معاشرے اور ملک وریاست کی سطح پر اقامتِ دین اور جہاد وقتال کی فرضیت کا معاملہ ہے جو کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہے۔اس میں امورِ سیاست' عدالت وقضا' امن وامان کا

قیام اور امورِ سفارت ومعیشت وغیرہ سب شامل ہیں جن کا بار اصلاً انتظامیہ' مقننہ اور دیگر ریاستی اداروں پر ہے نہ کہ عام عوام پر۔

تاہم یہ بات امرِ مسلم ہے کہ آج مسلمان ملکوں' حکومتوں' اور عوام کا معاملہ ماضی کے حالات سے یکسر مختلف ہے۔ اب نہ تو اُمّت بحیثیت اُمّتِ مسلمہ کہیں پائی جاتی ہے اور نہ ہی حکومت وریاست کے اربابِ اختیار اپنے اُس فرضِ عین کی ادائیگی پر کمر بستہ ہیں جس کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا جو فریضہ انتظامیہ' مقننہ اور دیگر ریاستی اداروں پر عائد ہوتا تھا اب کے حالات میں اُس کی ذمہ داری پوری امت پر اجتماعی طور پر عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین ومتاخرین علماء میں اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ ریاست وحکومت کی سطح پر دین کا قیام' یا بالفاظِ دیگر ''نصبِ امامت'' دین کے عظیم ترین فرائض میں سے ایک ہے ☆۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''اِس بات کا جاننا ضروری ہے کہ ریاست وحکومت کا قیام دین کے عظیم ترین فرائض میں سے ہے' دین کا قیام اس کے بغیر ممکن ہی نہیں''۔ علامہ تفتازانیؒ نے ''شرح المقاصد'' میں لکھا ہے: ''امام کا مقرر کرنا ہمارے نزدیک واجب سمعی ہے (یعنی دلیل نقلی سے ثابت ہے)''۔ امام ابن حزمؒ نے تو صراحتاً فرضیت امامت کبریٰ پر اجماع نقل کیا ہے' اور صرف ''خوارج'' جیسے گمراہ طبقے کو اس اجماع کا مخالف بتایا ہے۔ امام کے مطابق: ''نصبِ امامت کے وجوب پر جو اجماع ہے اس کی کسی نے مخالفت نہیں کی سوائے خوارج میں سے ایک فرقہ کے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں پر یہ لازم نہیں کہ وہ امام مقرر کریں' بلکہ ان پر تو اس قدر ذمہ داری ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق برابر ادا کریں''۔ اور ہمارے خیال میں اس فرقہ میں سے کوئی بھی آج موجود نہیں''۔ عظیم مؤرخ' فلسفی' فقیہ اور ماہر علوم معاشرت علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں: ''بے شک امام (خلیفہ) کا مقرر کرنا فرض ہے۔ اِس کا وجوب شریعت سے' صحابہ وتابعین کے اجماع سے ثابت ہوتا ہے..... اور اسی طرح ہر زمانے میں ہوتا رہا اور اس بات پر اجماع ہو گیا جو نصبِ امامت کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔''

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی اس مسئلہ میں کافی کلام فرمایا ہے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے مقاصدِ بعثت اور ان کے حصول کی نبوی تدابیر کا تفصیلاً ذکر کرنے اور اقامتِ دین اور نصبِ امامت کی اہمیت وفرضیت پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد لکھا ہے: ''خدا تعالیٰ نے جہاد کو' قضا کو' علومِ دینیہ کے زندہ کرنے کو' ارکانِ اسلام کے قائم کرنے کو' بلادِ اسلامیہ سے کفار کے دفع کرنے کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے اور تمام امور' امام (یعنی خلیفہ) کے مقرر کیے بغیر صورت پذیر نہیں ہو سکتے' اور (قاعدہ کلیہ ہے) کہ فرض کا حصول جس چیز پر موقوف ہو اس کا حصول بھی فرض قرار پائے گا اور اس قاعدہ پر بڑے بڑے صحابہؓ نے اُمت کو متنبہ کر دیا ہے۔''

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی دینی جدوجہد کا مرکزی نکتہ بھی اسی دینی فریضہ کی علمی وعملی آبیاری ہی تھا۔ وہ لکھتے ہیں: ''ہر ذی شعور مسلمان کا اولین فرض ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دے دے (جو لازماً اطاعتِ رسول ہی کے واسطہ سے ہوگی)۔ اس رویے کا نام عبادتِ رب ہے جو کہ ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت دینے کے لیے تمام انبیاء ورسل مبعوث ہوئے اور جواز روئے قرآن جنّوں اور انسانوں کا عین مقصدِ تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت وقوت' فرصت وفراغت' صلاحیت واستعداد' مال ودولت اور وسائل وذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' احقاقِ حق اور ابطالِ باطل' دعوت الی اللہ اور تبلیغِ دین' نصرتِ خدا اور رسول ﷺ اور حمایت واقامتِ دین اور شہادت علی الناس اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلہ کے لیے وقف کر دے اور اس کے لیے محنت ومشقت' انفاق وایثار' ترک واختیار' ابتلاء وآزمائش' صبر ومصابرت' استقامت ومقاومت..... الغرض ہجرت وجہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لیے مقدور بھر ہمت وعزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت واستعداد اور مطابق وسعت وقوت عائد ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے''۔ دبستانِ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسی تراثِ علمی کا علمبردار ہے!

☆ نوٹ: تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے اویس پاشا قرنی کی زیرِ طبع کتاب ''اقامتِ دین: فرضیت اور طریق کار' چند مباحث''۔

# قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
ترتیب وتدوین: سید برہان علی۔ حافظ محمد زاہد

## سُورۂ مُحمّد

سورۃ الاحزاب کے بعد (سورۂ سبا سے) مکی سورتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ سورۃ الاحقاف پر مکمل ہوا۔ ان تیرہ مکی سورتوں کے بعد اب تین مدنی سورتیں (محمدؐ، الفتح، الحجرات) آ رہی ہیں۔ یہ تینوں سورتیں بلاتمہید شروع ہو جاتی ہیں، یعنی نہ تو ان کے آغاز میں حروفِ مقطعات ہیں اور نہ ہی کوئی اور تمہیدی کلمات یا مضامین۔ بالخصوص سورۂ محمد کا آغاز تو ایسے ہو رہا ہے جیسے اچانک گفتگو ہوتی ہے۔ فرمایا:

﴿اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ ①﴾

''وہ لوگ کہ جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی اور اللہ کے راستے سے (خود بھی رُکے اور دوسروں کو بھی) روکا تو اللہ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا۔''

یعنی اگر انہوں نے اس سے پہلے کوئی نیکیاں کی بھی تھیں تو حق کے آ جانے کے بعد اس کو رد کر دینے کی پاداش میں ان کی وہ نیکیاں بھی ضائع ہو گئیں۔ اگلی آیت میں اس کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کا تذکرہ فرمایا گیا:

﴿وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۙ کَفَّرَ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ اَصۡلَحَ بَالَہُمۡ ②﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور ایمان لائے اس شے پر جو محمد (ﷺ) پر نازل ہوئی، اور وہ ان کے رب کی طرف سے برحق ہے، اللہ تعالیٰ اُن سے اُن کی تمام برائیاں دور کر دے گا اور ان کے تمام معاملات کو صحیح کر دے گا۔''

آیت ۴ میں ایک اہم مضمون آیا ہے، اس کا تقابل سورۃ الانفال کی آیت ۶۷ سے کرنا ہوگا۔ یہ ایک اہم علمی مسئلہ ہے، اس لیے اس پر غور وخوض کی ضرورت ہے۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے کا جو فیصلہ ہوا تھا، سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُس پر ناپسندیدگی کا اظہار ہوا تھا۔ یعنی کفر کی کمر توڑے بغیر اگر ان

قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تو یہ دوبارہ کفر کی طرف سے طاقت بن کر حملہ آور ہوں گے۔ جبکہ یہاں واضح کیا جا رہا ہے کہ ہاں جب اسلام کو فیصلہ کن فتح حاصل ہو جائے اور کفر کی طاقت کو کچل دیا جائے تو پھر ان کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑا جا سکتا ہے۔ فرمایا:

''پھر جب تم کافروں سے بھڑ جاؤ تو ان کی گردنیں اُڑا دو۔ یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو۔ پھر یا تو احسان کر کے چھوڑ دو یا کچھ مال لے کر' یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے (یعنی دشمن میں جنگ کی طاقت نہ رہے اور لڑائی موقوف ہو جائے)۔''

آیت ۷ میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷﴾

''اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔''

نصرتِ خداوندی کے ضمن میں قاعدہ یہی ہے کہ جو لوگ اللہ کے دین کے لیے جِدّوجُہد کرتے ہیں' جس کو اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے تعبیر کرتا ہے' اللہ کی مدد اُن ہی کے شامل حال ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جن کی دوستیاں اور وفاداریاں اللہ کے باغیوں کے ساتھ ہوں اور پھر وہ اللہ کی مدد بھی چاہیں تو اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

آیت ۱۱ میں ایک اہم حقیقت واضح کر دی گئی:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱﴾

''یہ اس لیے ہے کہ اللہ کارساز اور مددگار ہے مؤمنین کا اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔''

غزوۂ اُحد میں عارضی شکست کے بعد جب نبی کریم ﷺ مسلمانوں کو لے کر کوہِ اُحد پر چڑھ گئے تھے تو ابوسفیان' جو اُس وقت کفار کی فوج کا سپہ سالار تھے' نے نعرہ لگایا تھا: لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَكُمْ ۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہلوایا: اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰكُمْ ۔ یہ بعینہٖ اسی آیت کا مفہوم ہے۔

آیت ۱۵ میں اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کی صفات کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ کیا دوزخ اور جنت والے برابر ہو سکتے ہیں؟

''جنت' جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے' اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بو نہیں کرے گا' اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلے گا' اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے (سراسر) لذّت ہے' اور شہد مصفّا کی نہریں ہیں (جو حلاوت ہی حلاوت ہے)۔ اور (وہاں) ان کے لیے ہر قسم کے میوے ہیں اور بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے۔ (کیا یہ پرہیزگار) ان کی طرح (ہو سکتے ہیں) جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور جن کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا؟''

تیسرے رکوع میں منافقین کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب کوئی محکم سورۃ نازل ہوتی ہے اور اس میں قتال کا ذکر ہوتا ہے تو تم دیکھتے ہو اُن لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ (نفاق) ہے کہ وہ تمہاری طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے ان پر موت کی غشی طاری ہو۔ موت کے خوف اور دہشت کی وجہ سے اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہوتی ہیں۔ پس ہلاکت ہے ایسے لوگوں کے لیے۔ (آیت ۲۰)

اگلی آیت میں اہلِ ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ اطاعت کرو اور قولِ معروف اختیار کرو‘ پھر جب معاملہ طے ہو جائے (یعنی جنگ کا فیصلہ ہو جائے) تو پھر اگر وہ اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد کو پورا کریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُن کو خیر عطا فرمائے گا۔ (آیت ۲۱)

اسی سورۃ میں قرآن پر غور و فکر کرنے کے حوالے سے ایک عظیم آیت آئی ہے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے یہ لوگ جو حق کو نہیں مانتے اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾﴾

''کیا یہ لوگ قرآن مجید پر تدبّر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟''

اس کے ساتھ ہی قرآن حکیم کے بارے میں منافقین کے طرزِ عمل کا ذکر فرمایا گیا:

''حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اُلٹے پاؤں پھر گئے بعد اس کے کہ ان پر ہدایت واضح ہو گئی ان کو شیطان نے فریب دیا ہے اور ان کی (آرزوؤں کی) رسیاں دراز کر دی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے ان لوگوں سے کہا جنہوں نے اللہ کی نازل کردہ کتاب کو ناپسند کیا کہ بعض معاملات میں ہم آپ کی پیروی کریں گے‘ اور اللہ ان کی راز داری کی باتوں کو خوب جانتا ہے۔ اس دن ان کا کیا حال ہو گا جب ملائکہ ان کی جانیں قبض کریں گے اور ان کے چہروں اور پیٹھوں پر ماریں گے۔'' (آیات ۲۵ تا ۲۷)

آیت ۳۱ میں مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے‘ تمہارے تمام حالات کی جانچ پڑتال کر کے رہیں گے کہ کون ہیں تم میں جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے!

اس سورۃ کی آخری آیت (۳۸) میں انفاق فی سبیل اللہ کا تذکرہ ہے —— سورۃ البقرۃ کے مضامین میں قتال کے ساتھ ساتھ انفاق پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے‘ اس لیے کہ جان اور مال دونوں اللہ کی راہ میں کھپانا ضروری ہیں۔ اس سورۃ میں بھی قتال کے بعد اب انفاق کا تذکرہ ہے۔ فرمایا:

''تم وہ لوگ ہو جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو! تو تم میں سے بخل کرنے والے بھی ہیں۔ اور جو کوئی بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔ اور اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔ اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح کے نہیں ہوں گے۔''

چنانچہ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر تم نبی کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے اپنے مشن سے روگردانی اور اپنے فرضِ منصبی سے پہلوتہی کرو گے تو اللہ تمہیں ہٹا کر اپنے دین کا جھنڈا کسی اور قوم کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

# سُورۃُ الفَتح

یہ سورۂ مبارکہ پوری کی پوری صلح حدیبیہ کے گرد گھومتی ہے۔ صلح حدیبیہ کو ''فتح مبین'' قرار دیتے ہوئے نبی اکرم ﷺ سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ

عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳﴾

''ہم نے آپؐ کو یہ فتح مبین عطا فرمائی ہے تاکہ اللہ آپ کی خطاؤں کو معاف فرما دے جو پہلے ہوئی ہیں یا بعد میں ہوں گی' اور آپ پر اپنی نعمتوں کا اتمام کر دے اور آپ کی سیدھی راہ کی جانب راہنمائی فرمائے۔ اور اللہ آپ کی زبردست مدد فرمائے۔''

یہاں ایک علمی سا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ حضورﷺ کی وہ کون سی خطائیں ہیں جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہو رہا ہے۔ اس کا مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نبی کریمﷺ اقامت دین کی جدوجہد میں جو تدبیریں اختیار فرماتے تھے اُن میں حضورﷺ کے اپنے تدبّر' معاملہ فہمی' دور اندیشی اور منصوبہ بندی کو بڑا دخل حاصل تھا۔ ان معاملات میں بربنائے بشریت کہیں کوئی کمی رہ جانا قرینِ قیاس ہے۔ میں اس کا یہ مفہوم سمجھتا ہوں کہ اس گھمبیر جدّوجہد میں اگر کہیں حکمتِ عملی کے اعتبار سے (strategically) کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس فتح مبین کے بعد اللہ تعالیٰ ایسی کمیوں کے اثرات دور فرما دے گا۔

آیت ۱۰ میں بیعتِ شجرہ (بیعتِ رضوان) کا ذکر ہے جو سیرۃ النبیﷺ کے حوالہ سے ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۰﴾

''جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں حقیقت میں اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر جو کوئی عہد کو توڑے تو عہد توڑنے کا نقصان اسی کو ہے' اور جو کوئی اس بات کو جس کا اس نے اللہ سے عہد کیا ہے پورا کرے تو وہ اسے عنقریب اجرِ عظیم دے گا۔''

یہاں حضور اکرمﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کو اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے بیعت قرار دے رہا ہے۔ یہ مضمون سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ کے ساتھ جڑ جاتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ﴾ ''بے شک اللہ نے خرید لیے ہیں مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال بعوض جنت کے''۔ اصل میں تو خرید و فروخت اللہ اور بندے کے درمیان ہے' لیکن اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کریمﷺ اس بیع کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اسی لیے کہا جا رہا ہے کہ یہ جو آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو رہی ہے یہ دراصل اللہ کے ساتھ بیعت ہو رہی ہے۔

تیسرے رکوع' آیت ۱۸ میں اسی بیعت کے حوالہ سے فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝۱۸﴾

''اللہ اُن مؤمنوں سے راضی ہو گیا جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے' اور اللہ کے علم میں تھا جو کچھ کہ اُن کے دلوں میں تھا' تو اللہ نے اُن پر سکینت نازل فرمائی اور ایک فتح قریب اُن کو عطا فرمائی۔''

درحقیقت یہ معاملہ ایک مقدمہ بننے والا تھا فتح مکہ کے لیے' اور اس میں ایک بڑی حکمت ہے جو آیت

۲۴۔۲۵ میں بیان ہوئی ہے کہ اُس وقت اللہ نے فریقین کے ہاتھ کیوں روک دیے تھے اور یہ صلح کیوں ہوئی تھی؟ اُس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مکہ میں ایسے اہلِ ایمان ضعفاء موجود تھے جو کسی وجہ سے ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ اگر جنگ ہو جاتی تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جانے کے مصداق ممکن ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں وہ بھی کچلے جاتے۔ اس حکمت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور وہی تو ہے جس نے روک دیے اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے مکہ کی وادی میں اس کے بعد کہ اللہ تمہیں اُن پر فتح دے چکا تھا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو روکا مسجد حرام سے اور ہدی کے جانوروں کو (بھی روکا) کہ وہ پہنچیں اپنے مقام پر۔ اگر نہ ہوتے وہ مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں جن کو تم نہیں جانتے تھے، ہو سکتا تھا کہ تم انہیں کچل ڈالتے اور لاعلمی میں ان کی طرف سے تمہیں بھی نقصان پہنچتا (تو سب قصہ طے کر دیا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ داخل کرے اپنی رحمت میں جس کو چاہے۔ اگر (دونوں فریق) الگ الگ ہو جاتے تو جو ان میں کافر تھے ہم ان کو دکھ دینے والا عذاب دیتے۔'' (آیات ۲۴۔۲۵)

اس سورۂ مبارکہ کا آخری حصہ بہت اہم ہے۔ جیسا کہ سب کے علم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سفر ایک خواب کی بنیاد پر کیا تھا کہ آپؐ عمرہ کر رہے ہیں، لیکن واپسی بغیر عمرہ ادا کیے ہوئی، جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کے دلوں میں ایک بے چینی پیدا ہوئی، جس کا ازالہ کیا جا رہا ہے اور فرمایا جا رہا ہے:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾﴾

''بے شک اللہ نے اپنے رسولؐ کو سچا (اور) حقیقت پر مبنی خواب دکھایا تھا۔ تم لازماً داخل ہو گے مسجد حرام میں، ان شاء اللہ، پورے امن کے ساتھ اور اپنے سروں کو منڈواتے ہوئے اور بال کتراتے ہوئے بغیر کسی خوف کے۔ اللہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہیں جانتے تھے، پس اس نے اس (خواب کے پورا ہونے) سے پہلے یہ قریبی فتح دے دی۔''

اگلی آیت میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد بایں الفاظ بیان کیا جا رہا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾﴾

''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کر دے کُل کے کُل دین پر۔ اور اللہ کافی ہے بطورِ گواہ۔''

اس کے بعد آخری آیت میں نبی کریم ﷺ اور آپؐ کی جماعت کے افراد کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''محمد (ﷺ) اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں سخت اور آپس میں رحم دل ہیں، تم ان کو رکوع اور سجود میں مشغول پاتے ہو، تلاش کرتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضا۔ ان کے چہروں پر نشان ہیں سجود کے اثر سے.....''

# سُورۃُ الحُجُرات

یہ عظیم سورۃ اجتماعیاتِ انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف قومی و ملّی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی تأسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم رنگی کیسے برقرار رکھی جا سکتی ہے' بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے' اس کا دستورِ اساسی کیا ہے' اس کی شہریت کسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس سورۃ کو بغرض تفہیم تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیے: پہلا حصہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے 'اصل الاصول' یعنی اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی اور ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے اصل قوام یعنی ''مرکز ملت'' سے بحث کرتا ہے —— دوسرا حصہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملتِ اسلامیہ کے افراد اور گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبت والفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف وانتشار اور فتنہ وفساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے —— تیسرا حصہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے: پہلی بحث انسان کی عزت وشرف کے معیار سے متعلق ہے' جبکہ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق وامتیاز کی وضاحت سے متعلق ہے۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم طور پر یہ واضح فرما دیا کہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست ''مادر پدر آزاد'' نہیں ہوگی بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے تابع ہوگی۔ آیت کے آخر میں اس اطاعت کی اصل روح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ وہ تقویٰ ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①﴾

''اے ایمان والو! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

آگے آیت ۲ تا ۸ (سوائے آیت ۶ کے) میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ''اصل ثانی'' کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے' یعنی رسول اللہ ﷺ کا ادب' محبت اور تعظیم وتوقیر۔ چنانچہ فرمایا:

''اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور مت گفتگو کرو انؐ سے بلند آوازی کے ساتھ جیسے تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کر لیتے ہو' مبادا تمہارے تمام اعمال رائیگاں ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور تک نہ ہو۔ یقیناً وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول (ﷺ) کے سامنے پست رکھتے ہیں' وہی ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔ بلاشبہ وہ لوگ جو (اے نبی ﷺ) آپ کو پکارتے ہیں حجروں کے باہر سے' ان میں اکثر ناسمجھ

ہیں۔اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپؐ خود ان کے پاس تشریف لاتے تو یہ ان کے لیے کہیں بہتر تھا۔ اور اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔.....اور جان رکھو کہ تمہارے مابین اللہ کے رسول (ﷺ) موجود ہیں۔اگر وہ تمہارا کہنا اکثر معاملات میں ماننے لگیں تو تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے' لیکن اللہ نے تو ایمان کو تمہارے نزدیک بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے' اور تمہارے نزدیک بہت ناپسندیدہ بنا دیا ہے کفر کو بھی اور نافرمانی کو بھی اور معصیت کو بھی۔یہی ہیں وہ لوگ جو اصل میں کامیاب ہونے والے ہیں۔یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور مظہر ہے اس کی نعمت کا۔اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔'' (آیات ۲ تا ۸)

دوسرے حصے سے متعلق احکام کو مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک وہ اہم تر احکام جو وسیع پیمانہ پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقتاً نہایت بنیادی احکام جو خاص انفرادی سطح پر نفرت وعداوت کا سدباب کرتے ہیں۔مقدم الذکر احکام دو ہیں: افواہوں کی روک تھام اور نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرزِ عمل۔

آیت ۶ میں افواہوں کی روک تھام کے ضمن میں یہ حکم دیا گیا کہ کسی کے خلاف اقدام کرنے سے پہلے خبر کی تحقیق کر لیا کرو۔فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝۶ ﴾

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو چھان بین کر لیا کرو' مبادا تم نادانی میں کسی قوم کے خلاف اقدام کر بیٹھو اور پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔''

اس کے ضمن یہ اصول یاد رکھیں کہ اس صورتحال میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ خبر لانے والا کون ہے! اگر وہ کوئی انتہائی معتبر شخصیت ہو تو کسی تحقیق' کسی تبیین اور کسی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے' لیکن اگر خبر لانے والا کوئی ایسا شخص ہے کہ جو احکام الٰہیہ پر اس طور سے کاربند نہیں ہے جس طرح ایک مؤمن صادق کو ہونا چاہیے تو ایسے شخص کی لائی ہوئی خبر پر کوئی اقدام کرنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے' لہٰذا اس کی تحقیق' تبیین اور تفتیش ضروری ہے۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے بیان کر دے۔''

آیات ۹'۱۰ بھی مسلمانوں کی شیرازہ بندی سے متعلق ہیں کہ اگر احتیاط کے باوجود مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین کوئی نزاع برپا ہو جائے' کوئی جھگڑا ہو جائے' کسی نوع کا اختلاف ہو جائے اور یہ اس شدت کو پہنچ جائے کہ وہ باہم ایک دوسرے سے لڑ پڑیں تو ایک مسلم معاشرے کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ ''Nip the evil in the bud'' کے مصداق ان میں فوری صلح کرا دے:

''اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کرا دو' اور اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرنے پر مصر رہے تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے۔پھر اگر وہ اللہ کے حکم کو تسلیم کر لے تو پھر صلح کرا دو ان دونوں کے مابین انصاف کے ساتھ' اور عدل

سے کام لو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ یقیناً تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں' پس تم اپنے بھائیوں کے مابین صلح کرا دیا کرو' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (اس کی نافرمانی سے بچو) تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

مؤخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں۔ آیات ۱۱'۱۲ میں ان چھ معاشرتی برائیوں کا ذکر کر کے ان سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبت و الفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت و عداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ ان چھ معاشرتی برائیوں کا تذکرہ بایں الفاظ کیا گیا:

(۱) ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ .....﴾ ''اے ایمان والو! تم میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے.....'' (۲) ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ''۔ (۳) ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ''اور ایک دوسرے کے برے نام نہ ڈالو''۔ (آیت ۱۱) (۴) ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''اے ایمان والو! سوئے ظن سے بچتے رہو' بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں''۔ (۵) ﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور کسی کا راز نہ تلاش کرو''۔ (۶) ﴿وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ ''اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔'' (آیت ۱۲)

تیسرے حصے کے دو مباحث میں سے پہلی بحث انسان کی عزت و شرف کے معیار سے متعلق ہے' جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا کہ انسان کی عزت و ذلت یا شرافت و رذالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ' نہ خاندان ہے نہ قوم' نہ رنگ ہے نہ نسل' نہ ملک ہے نہ وطن' نہ دولت ہے نہ ثروت' نہ شکل ہے نہ صورت' نہ حیثیت ہے نہ وجاہت' نہ پیشہ ہے نہ صرفہ' اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ' بلکہ صرف تقویٰ ہے۔ اس لیے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی جوڑے (آدم و حوا) کی اولاد بھی۔ چنانچہ آیت ۱۳ میں ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۳﴾﴾

''اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی شکل میں تقسیم کیا تاکہ باہم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کچھ) جاننے والا (اور) باخبر ہے۔''

پوری سورت میں یہ ایک ہی آیت ہے جو یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ سے شروع ہوئی ہے جبکہ پانچ دفعہ ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' آیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ نہ نسلی معاشرہ ہے نہ لسانی' یہ حقیقتاً ایمان اور دستوراً و قانوناً اسلام کا اقرار کرنے والوں کا معاشرہ ہے۔

تیسرے حصے کی دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز سے متعلق ہے۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مؤمن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں' لیکن اس سورۂ مبارکہ میں ایمان اور

اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ''ایمان'' کی نفیٔ کامل کے علی الرغم ''اسلام'' کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس کا اصل مقصد اس اہم اور بنیادی حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں بلکہ اسلام پر ہے' اس لیے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہٰذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویے کی بنیاد پر استوار کیا جائے' جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف ''اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ'' والا پہلو شامل ہوسکتا ہے۔

آیت ۱۴ میں ایمان و اسلام کا فرق واضح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾

''یہ بدّو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ تاہم اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال (کے اجر و ثواب) میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔''

اس بحث سے اس عظیم حقیقت کی جانب بھی رہنمائی ہوگئی کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اُس کے دل میں نہ تو مثبت اور ایجابی طور پر ایمان ہی محقّق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق' بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو' لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت موجود ہو۔ ایسی حالت میں اس قاعدہ وکلیہ کی رو سے کہ ''بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں'' ایسے شخص کی اطاعت قبول نہ کی جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ دو اسمائے حسنیٰ غفور اور رحیم استعمال کر کے اس اطاعت کو بھی سندِ قبولیت عطا فرما دی۔

آیت ۱۵ میں ''حقیقی ایمان'' کی ایک جامع و مانع تعریف بیان کرتے ہوئے واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے نہ چبھے رہ گئے ہوں اور جس کا اولین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے' یعنی یہ کہ انسان ہدایتِ آسمانی کی نشر و اشاعت' حق کی شہادت اور اللہ کے دین کی تبلیغ اور اس کے غلبہ و اظہار کے لیے جان و مال سے کوشش کرے اور اس جدّ و جہد میں اپنا تَن مَن دھن سب قربان کر دے۔

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

# ترجمۂ قرآن مجید

## مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

## سورۃ النساء

## آیات ۳۶۔۳۷

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝

### ج و ر

جَارَ۔ یَجُوْرُ (ن) جَوْرًا: (۱) کسی چیز سے ہٹ جانا‘ بھٹک جانا‘ گمراہ ہونا۔ (۲) کسی چیز کے قریب ہونا‘ پڑوسی ہونا‘ حمایتی ہونا۔

جَائِرٌ (اسم الفاعل) : بھٹکنے والا۔ ﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۭ﴾ (النحل:۹) ’’اور اللہ پر یعنی اُس تک معتدل راہ ہے اور کوئی اس سے بھٹکنے والا ہے۔‘‘

جَارٌ (اسمِ صفت) : پڑوسی‘ حمایتی۔ ﴿لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ﴾ (الانفال:٤٨) ’’کوئی غالب آنے والا نہیں تم پر آج کے دن لوگوں میں سے اور میں تمہارا حمایتی ہوں۔‘‘

اَجَارَ (افعال) اِجَارَةً : (۱) کسی کو کسی سے دور کرنا‘ بچانا۔ (۲) قریب کرنا‘ پناہ دینا۔ ﴿فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۲۸﴾ (الملک) ’’تو کون بچائے گا کافروں کو ایک دردناک عذاب سے!‘‘

جَاوَرَ (مفاعلہ) جِوَارًا : کسی کے پڑوس میں رہنا۔ ﴿ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۶۰﴾ (الاحزاب) ’’پھر وہ لوگ تمہارے پاس نہیں رہیں گے اس میں (یعنی مدینہ میں) مگر تھوڑے دن۔‘‘

تَجَاوَرَ (تفاعل) تَجَاوُرًا: ایک دوسرے کے قریب ہونا، متصل ہونا۔

مُتَجَاوِرٌ (اسم الفاعل): ایک دوسرے کے قریب ہونے والا۔ ﴿وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ﴾ (الرعد:٤) ''اور زمین میں ایک دوسرے کے قریب قطعات ہیں۔''

اِسْتَجَارَ (استفعال) اِسْتِجَارَةً: پناہ مانگنا۔ ﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ﴾ (التوبة:٦) ''اور اگر مشرکوں میں سے کوئی ایک پناہ مانگے تم سے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ سنے اللہ کے کلام کو، پھر اس کو پہنچا دو اس کے امن کی جگہ میں۔''

## ف خ ر

فَخَرَ يَفْخُرُ (ن) فَخْرًا: فخر کرنا۔

فَخُوْرٌ (فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ): بے انتہا فخر کرنے والا، اترانے والا۔ آیت زیر مطالعہ۔

فَخَّارٌ (فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ): بہت فخر کرنے والا۔ پھر استعارۃً پانی رکھنے کے مٹکے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾﴾ (الرحمٰن) ''اس نے پیدا کیا انسان کو کھنکتی مٹی سے جیسے پانی کا مٹکا۔''

تَفَاخَرَ (تفاعل) تَفَاخُرًا: ایک دوسرے پر فخر کرنا۔ ﴿وَتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ﴾ (الحدید: ٢٠) ''اور تمہارا ایک دوسرے پر فخر کرنا۔''

**ترکیب**: ''اِحْسَانًا'' فعل محذوف ''اَحْسِنُوْا'' کا مفعول مطلق ہے، جبکہ ''بِالْوَالِدَيْنِ'' اور ''بِذِی الْقُرْبٰی'' سے ''مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' تک متعلق فعل ہیں۔ ''يُحِبُّ'' کا مفعول ''مَا'' ہے۔

**ترجمہ:**

| | |
|---|---|
| وَاعْبُدُوا: اور تم بندگی کرو | اللّٰهَ: اللہ کی |
| وَلَا تُشْرِكُوْا: اور شریک مت کرو | بِهٖ: اس کے ساتھ |
| شَيْئًا: کچھ بھی | وَّبِالْوَالِدَيْنِ: اور (حسن سلوک کرو) والدین سے |
| اِحْسَانًا: جیسا حسن سلوک کا حق ہے | وَّبِذِی الْقُرْبٰی: اور قرابت داروں سے |
| وَالْيَتٰمٰی: اور یتیموں سے | وَالْمَسٰكِيْنِ: اور مسکینوں سے |
| وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی: اور رشتہ دار پڑوسی سے | وَالْجَارِ الْجُنُبِ: اور دور والے پڑوسی سے |
| وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ: اور پہلو کے ساتھ رہنے والے سے | وَابْنِ السَّبِيْلِ: اور مسافروں سے |
| وَمَا: اور اس سے جس کے | مَلَكَتْ: مالک ہوئے |
| اَيْمَانُكُمْ: تمہارے داہنے ہاتھ | اِنَّ اللّٰهَ: یقیناً اللہ |

| | |
|---|---|
| لَا يُحِبُّ : پسند نہیں کرتا | مَنْ : اس کو جو |
| كَانَ : ہو | مُخْتَالًا : تکبّر کرنے والا |
| فَخُوْرًا : اترانے والا | الَّذِيْنَ : وہ (لوگ) جو |
| يَبْخَلُوْنَ : کنجوسی کرتے ہیں | وَيَأْمُرُوْنَ : اور ترغیب دیتے ہیں |
| النَّاسَ : لوگوں کو | بِالْبُخْلِ : کنجوسی کی |
| وَيَكْتُمُوْنَ : اور چھپاتے ہیں | مَآ : اس کو جو |
| اٰتٰهُمُ : دیا ان کو | اللّٰهُ : اللہ نے |
| مِنْ فَضْلِهٖ : اپنے فضل سے | وَاَعْتَدْنَا : اور ہم نے تیار کیا |
| لِلْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے لیے | عَذَابًا مُّهِيْنًا : ایک رسوا کرنے والا عذاب |

**نوٹ**: ان آیات میں اصل ہدایت حقوق العباد کی ہے' لیکن بات کی ابتدا حقوق اللہ سے کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برادری یا سوسائٹی کے دباؤ اور حکومت کے قوانین سے بچنے کی کوئی راہ انسان تلاش کر ہی لیتا ہے۔ کسی کو دوسروں کا حق ادا کرنے کے لیے حقیقتاً اگر کوئی چیز آمادہ کر سکتی ہے تو وہ صرف اللہ کے سامنے جوابدہی کا خوف ہے۔ اس لیے دوسروں کا حق ادا کرنے کی تاکید سے پہلے اس احساس کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

جس کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا' اسے سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ کن لوگوں کا ہم پر حق بنتا ہے' جو ہمیں ادا کرنا ہے۔ آیت میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس ضمن میں **وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ** کے الفاظ غور طلب ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہیں' ہم پہلو ساتھی یعنی ہم نشین۔ یہ بہت ہمہ گیر لفظ ہے۔ اس میں بیوی' بچے' دیگر اہل خانہ اور قریبی پڑوسی کے علاوہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جن سے کاروبار' ملازمت' سفر اور بازار میں خرید و فروخت کے دوران ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ اسی طرح آج کل غلام نہیں ہوتے لیکن ان کی جگہ گھریلو ملازمین کے حقوق آجاتے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے تمام لوگوں کے ہم پر کیا حقوق ہیں؟ اس کے لیے نبی کریم ﷺ ایک اصولی راہنمائی دے گئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ اس اصول کے تحت ہر شخص آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ دوسروں کے اس پر کیا حقوق ہیں۔ البتہ چند تعلقات کے کچھ پہلوؤں کی اس اصول سے پوری طرح وضاحت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شوہر بیوی بن کر نہیں سوچ سکتا کہ وہ اپنے لیے کیا پسند کرتی ہے' نہ ہی بیوی شوہر بن کر سوچ سکتی ہے۔ ایک بچہ جب تک خود باپ نہ بن جائے' اس وقت تک وہ نہیں سوچ سکتا کہ ایک والد کیا پسند کرتا ہے۔ تعلقاتِ باہمی کے ایسے پہلوؤں کی وضاحت قرآن مجید اور احادیث میں کر دی گئی ہے۔

اللہ کے بعد بندوں کا حق آتا ہے' لیکن ہماری آخرت کے بننے یا بگڑنے کے لحاظ سے بندوں کا حق زیادہ خطرناک ہے' کیونکہ اللہ کے حقوق میں کوتاہی سچی توبہ کرنے سے معاف ہو جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ بندہ اگر شرک

سے بھی سچی توبہ کرلے تو وہ بھی معاف ہو جائے گا لیکن کسی بندے کا حق اللہ بھی معاف نہیں کرے گا جب تک بندہ نہ معاف کرے اور بندوں سے معاف کرانا بھی صرف اس دنیا میں ممکن ہے' آخرت میں کوئی کسی کو معاف نہیں کرے گا۔

بندوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے' اس لیے اس کے متعلق ہدایات زیادہ ہیں۔ والدین اگر مشرک ہوں اور شرک کا حکم دیں تو ان کی بات نہیں ماننی ہے' لیکن اس کے باوجود ان سے بدتمیزی کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ان کی خدمت میں کوئی کمی کر سکتے ہیں (لقمان: ۱۵)۔ رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا کہ اس کی ناک خاک آلود ہو جس نے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو بوڑھا پایا اور جنتی نہ ہو گیا (مسلم)۔ آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو چاہتا ہے کہ اس کے رزق اور عمر میں برکت ہو' اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے (بخاری و مسلم)۔ والدین کی فرمانبرداری یہاں تک ہے کہ اگر آپ نفل نماز پڑھ رہے ہیں اور ان میں سے کوئی آپ کو آواز دیتا ہے تو آپ نیت توڑ کر جائیں' ان کی بات سنیں' کوئی کام ہو تو اسے کر کے پھر نماز پڑھیں۔

ہم لوگوں میں اکثریت کا تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہم تو لوگوں کے حقوق کا خیال کرتے ہیں اور حتی الامکان ادا بھی کرتے ہیں لیکن دوسرے لوگ اس کا خیال نہیں کرتے۔ نوٹ کر لیں کہ ویسے تو صبر کرنا اچھی بات ہے' لیکن اس مرحلے پر خاموشی اختیار کرنا درست نہیں ہے' کیونکہ آپ دوسروں کی آخرت کی خرابی کو گوارا کر رہے ہیں حالانکہ آپ کو اپنی آخرت کی خرابی گوارا نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہم کیا کریں؟ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ تم لوگ دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے' یعنی مناسب اور موزوں موقع و محل دیکھ کر' اور اچھی نصیحت سے' یعنی انسان کی ذہنی سطح کے مطابق دل لگتی بات کہہ کر' اور اگر کبھی بحث و مباحثہ کرنا ہی پڑ جائے تو ان لوگوں سے مباحثہ کرو خوبصورت انداز میں' کیونکہ غصہ کرنے سے اور دوسروں کو برا بھلا کہنے سے تمہاری بات کی وقعت ختم ہو جاتی ہے (النحل: ۱۲۵)۔ اس لیے ادائیگی حقوق میں اگر کسی کی کوتاہی ہمارے علم میں آئے تو اسے آگاہ کر دینا چاہیے۔ معاشرے میں یہ روش عام ہو گئی تو کوئی ہماری کوتاہی سے ہم کو آگاہ کر دے گا۔ اگر سب نے خاموشی اختیار کرنے کی روش اپنا لی تو حق تلفیوں کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اور معاشرے کا حسن جاتا رہے گا۔

دوسروں کو ان کی کوتاہی سے آگاہ کرنے کے لیے جس احسن طریقے کی مذکورہ آیت میں ہدایت ہے' اس کی عملی تفسیر کی جانب ایک حدیث سے راہنمائی ملتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان' مسلمان کا آئینہ ہے''۔ اب غور کریں کہ آئینہ کیا کرتا ہے۔ آپ کے سر یا چہرے پر' جہاں آپ کی نظر نہیں جاتی' اگر کوئی ناپسندیدہ چیز لگی ہوئی ہے' تو آئینہ آپ کو آگاہ کر دیتا ہے۔ آئینہ کا دوسرا کام یہ ہے کہ آپ کی ناپسندیدہ چیز سے وہ نہ صرف آپ کو آگاہ کرتا ہے' بلکہ آپ کے علاوہ کسی اور کو وہ کبھی نہیں بتاتا۔ آئینہ کا تیسرا کام یہ ہے کہ اس کی بتائی ہوئی چیز کو اگر آپ خود سے دور نہیں کرتے یعنی آئینہ کا مشورہ قبول نہیں کرتے تو وہ آپ سے ناراض نہیں ہوتا' نہ وہ کسی سے آپ کی شکایت کرتا ہے اور نہ ہی آپ سے قطع تعلق کرتا ہے بلکہ اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ احسن طریقے سے دوسروں کی اصلاح کرنے کے یہ تین اصول ہیں جو رسول اللہ ﷺ ہم کو دے گئے ہیں۔ جتنا زیادہ ہم اس پر عمل کریں گے' اتنا ہی معاشرے کے حسن میں اضافہ ہوگا۔

دوسروں کی اصلاح اسی کو زیب دیتی ہے جس نے خود اپنی اصلاح کر لی ہو۔ اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اپنے رویہ کو دوسروں کے رویہ کا تابع مت بناؤ' جو تمہارا حق مارتا ہے تم اس کا حق ادا کرو' کوئی تم سے بدسلوکی کرتا ہے تو تم اس کے ساتھ ظلم مت کرو۔ (تفہیم القرآن' الرعد:۲۲)

## آیات ۳۸ تا ۴۲

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۝ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؕ ۝ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝

### ق ر ن

قَرِنَ يَقْرَنُ (س) قَرَنًا : دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا باہم جمع ہونا' اکٹھا ہونا' جڑنا۔

قَرِيْنٌ ج قُرَنَآءُ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت) : ہر وقت جڑا رہنے والا' ساتھی' ہم نشین۔ ﴿وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۲۵) ''اور ہم نے تعینات کیے ان کے لیے کچھ ساتھی۔''

قَرْنٌ ج قُرُوْنٌ : زمانہ' ایک سو سال جمع ہونے کا عرصہ' پھر ایک زمانے میں ساتھ رہنے والے لوگوں کے لیے بھی آتا ہے۔ اُمت' جماعت۔ ﴿وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶﴾ (الانعام) ''اور ہم نے اٹھایا ان کے بعد ایک دوسری اُمت کو''۔ ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ﴾ (یونس:۱۳) ''اور ہم ہلاک کر چکے ہیں تم سے پہلے قوموں کو جب انہوں نے ظلم کیا۔''

قَرْنَيْنِ (قَرْنٌ کا تثنیہ) : ذُوالْقَرْنَيْنِ کا مطلب ہے دو زمانوں یا دو قوموں والا۔ قرآن میں یہ ایک بادشاہ کے نام (اسمِ علم) کے طور پر آیا ہے۔ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ؕ﴾ (الکھف:۸۳) ''یہ لوگ پوچھتے ہیں آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں۔''

قَارُوْنَ : موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کے ایک سرمایہ دار کا نام ہے۔ ﴿اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪﴾ (القصص:۷۶) ''بے شک قارون موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں سے تھا پھر اس نے بغاوت کی ان سے (یعنی قوم سے)۔''

اَقْرَنَ (افعال) اِقْرَانًا : دو یا زیادہ چیزوں کو اکٹھا کرنا' باندھنا۔

مُقْرِنٌ (اسم الفاعل) : باندھنے والا۔ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝۱۳﴾ (الزخرف) ''پاک ہے وہ جس نے مسخر کیا ہمارے لیے اس کو اور ہم نہیں تھے اس کو باندھنے والے (یعنی قابو

پانے والے)۔''

قَرَّنَ (تفعیل) تَقْرِیْنًا :خوب کس کے باندھنا۔

مُقَرَّنٌ (اسم المفعول) :کس کے باندھا ہوا۔﴿وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ (ابراھیم) ''اور تو دیکھے گا اس دن مجرموں کو بندھے ہوئے بیڑیوں میں۔''

اِقْتَرَنَ (افتعال) اِقْتِرَانًا: اہتمام سے متصل ہونا' جڑنا۔

مُقْتَرِنٌ (اسم الفاعل): جڑنے والا۔ ﴿اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ﴾ (الزخرف) ''یا آتے فرشتے اس کے ساتھ متصل ہونے والے ہوتے ہوئے (یعنی ساتھ رہنے والے)۔''

## ث ق ل

ثَقَلَ ۔ یَثْقُلُ (ن) ثَقْلًا :وزن معلوم کرنے کے لیے ہاتھ میں اٹھانا۔

ثَقَلٌ ج اَثْقَالٌ (اسم ذات) : وزن' بوجھ۔ ﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ (العنکبوت:۱۳) ''اور وہ لوگ لازماً اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور کچھ دوسرے بوجھ اپنے بوجھ کے ساتھ۔''

مِثْقَالٌ (اسم الآلہ) :تولنے کے اوزان' باٹ۔آیت زیر مطالعہ۔

ثَقُلَ یَثْقُلُ (ک) ثِقَالَةً: وزنی ہونا' بھاری ہونا۔﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف) ''پس بھاری ہوئے جس کے پلڑے تو وہ لوگ ہی مراد پانے والے ہیں۔''

ثَقِيْلٌ ج ثِقَالٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت): وزنی' بھاری۔﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ (المزمل) ''بے شک ہم ڈالیں گے آپؐ پر ایک بھاری بات''۔﴿وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ (الرعد) ''اور وہ اٹھاتا ہے بھاری بدلیوں کو۔''

اَثْقَلَ (افعال) اِثْقَالًا : کسی کو بھاری کرنا' کسی پر بوجھ لادنا۔﴿فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ﴾ (الاعراف:۱۸۹) ''پھر جب اس نے بھاری کیا تو دونوں نے پکارا اللہ کو۔''

مُثْقَلٌ (اسم المفعول) :لدا ہوا' بوجھ تلے دبا ہوا۔﴿وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا﴾ (فاطر:۱۸) ''اور جب پکارے گی کوئی لدی ہوئی جان اپنے بوجھ کی طرف۔''

تَثَاقَلَ (تفاعل) اِثَّاقُلًا :بوجھ کے سبب سے کسی طرف جھک جانا' مائل ہونا' گر پڑنا۔﴿اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (التوبۃ:۳۸) ''جب کہا جاتا ہے تم لوگوں سے کہ کوچ کرو اللہ کی راہ میں تو تم لوگ گرے پڑتے ہو زمین کی طرف۔''

**ترکیب**: ''یُنْفِقُوْنَ'' کا مفعول ''اَمْوَالَهُمْ'' ہے' جبکہ ''رِئَآءَ النَّاسِ'' حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہوا ہے۔''مَنْ'' شرطیہ ہے اس لیے ''یَكُنْ'' مجزوم ہوا ہے۔''اَلشَّيْطٰنُ'' اس کا اسم ہے اور ''قَرِيْنًا'' اس کی خبر ہے۔''فَسَآءَ'' فعل ذم ہے لیکن یہ جواب شرط بھی ہے اور آفاقی صداقت (البقرۃ:۴۹' نوٹ۲) بھی ہے' اس لیے اس کا ترجمہ حال میں ہوگا۔''قَرِيْنًا'' تمیز ہے۔''تَكُ'' کا اسم اس میں شامل ''هِيَ'' کی ضمیر ہے اور ''حَسَنَةً'' اس کی خبر ہے۔''يُضٰعِفْ'' کا فاعل اس میں ''هُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ کے لیے ہے۔''وَجِئْنَا'' کا

مفعول ''بِكَ'' ہے اور ''شَهِيْدًا'' تمیز ہے۔ ''تُسَوّٰی'' فعل مضارع مجہول ہے۔ ''اَلْاَرْضُ'' اس کا نائب فاعل ہے۔

**ترجمہ:**

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ :اور وہ (لوگ) جو | يُنْفِقُوْنَ :خرچ کرتے ہیں |
| اَمْوَالَهُمْ :اپنے مالوں کو | رِئَآءَ النَّاسِ :لوگوں کو دکھاتے ہوئے |
| وَلَا يُؤْمِنُوْنَ :اور ایمان نہیں لاتے | بِاللّٰهِ :اللہ پر |
| وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ :اور نہ ہی آخری دن پر | وَمَنْ :اور وہ |
| يَّكُنِ :ہوا | الشَّيْطٰنُ :شیطان |
| لَهٗ :جس کا | قَرِيْنًا :ساتھی |
| فَسَآءَ :تو وہ برا ہے | قَرِيْنًا :بطور ساتھی کے |
| وَمَاذَا :اور کیا ہے | عَلَيْهِمْ :ان پر |
| لَوْ :اگر | اٰمَنُوْا :وہ ایمان لائیں |
| بِاللّٰهِ :اللہ پر | وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ :اور آخری دن پر |
| وَاَنْفَقُوْا :اور خرچ کریں | مِمَّا :اس میں سے جو |
| رَزَقَهُمُ :عطا کیا ان کو | اللّٰهُ :اللہ نے |
| وَكَانَ :اور ہے | اللّٰهُ :اللہ |
| بِهِمْ :ان کو | عَلِيْمًا :جاننے والا |
| اِنَّ اللّٰهَ :یقیناً اللہ | لَا يَظْلِمُ :ظلم نہیں کرتا |
| مِثْقَالَ ذَرَّةٍ :کسی ذرے کے ہم وزن | وَاِنْ :اور اگر |
| تَكُ :وہ ہو | حَسَنَةً :کوئی نیکی |
| يُّضٰعِفْهَا :تو وہ کئی گنا بڑھاتا ہے اس کو | وَيُؤْتِ :اور وہ دیتا ہے |
| مِنْ لَّدُنْهُ :اپنے پاس سے | اَجْرًا عَظِيْمًا :ایک شاندار بدلہ |
| فَكَيْفَ :تو کیسا ہوگا (ان کا حال) | اِذَا :جب |
| جِئْنَا :ہم لائیں گے | مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ :ہر اُمت سے |
| بِشَهِيْدٍ :ایک گواہ کو | وَّجِئْنَا :اور ہم لائیں گے |
| بِكَ :آپؐ کو | عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ :ان لوگوں پر |
| شَهِيْدًا :بطور گواہ | يَوْمَئِذٍ :اس دن |
| يَّوَدُّ :چاہیں گے | الَّذِيْنَ :وہ (لوگ) جنہوں نے |

| | |
|---|---|
| كَفَرُوْا : کفر کیا | وَعَصَوُا : اورنافرمانی کی |
| الرَّسُوْلَ : اِن رسولؐ کی | لَوْ : کہ کاش |
| تُسَوّٰى : ہموار کردیا جائے | بِهِمُ : ان پر |
| الْاَرْضُ : زمین کو | وَلَا يَكْتُمُوْنَ : اور وہ نہیں چھپائیں گے |
| اللّٰهَ : اللہ سے | حَدِيْثًا : کوئی بات |

**نوٹ ۱**: آیت ۴۱ میں ''هٰٓؤُلَآءِ'' کا اشارہ رسول اللہ ﷺ کی اُمت کی طرف ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمت کے اعمال آپؐ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس طرح اس آیت سے معلوم ہوا کہ گزشتہ اُمتوں کے انبیاء اپنی اپنی اُمت پر بطور گواہ پیش ہوں گے اور آپؐ بھی اپنی اُمت کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ (معارف القرآن)

**نوٹ ۲**: قرآن مجید کے اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو اپنی کسی اُمت کے متعلق گواہی دے، ورنہ قرآن مجید میں اس کا بھی ذکر ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ آیت ختم نبوت کی دلیل بھی ہے۔ (معارف القرآن)

## آیت ۴۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝

**س ك ر**

سَكَرَ۔ يَسْكُرُ (ن) سَكْرًا : کسی چیز کی روانی کو روک دینا، جیسے دریا پر بند بنانا۔

سَكِرَ۔ يَسْكَرُ (س) سَكَرًا : عقل کی روانی کا رک جانا، غصہ یا نشے سے مدہوش ہونا۔

سَكَرٌ : مدہوش کرنے والی چیز، نشہ آور چیز۔ ﴿تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا﴾ (النحل:٦٧) ''تم لوگ بناتے ہو اس سے نشہ آور چیز۔''

سَكْرَةٌ : مدہوشی، نشہ۔ ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ﴾ (قٓ:١٩) ''اور آتی ہے موت کی مدہوشی حق کے ساتھ۔''

سُكٰرٰى : مبالغہ کے وزن فَعْلَانُ کی مؤنث فَعْلٰى اور جمع فُعَالٰى کے وزن پر آتی ہے۔ اس طرح سَكِرَ کے مبالغہ سَكْرٰى کی جمع سُكَارٰى ہے جسے قرآن مجید میں سُكٰرٰى لکھا گیا ہے۔ بہت زیادہ مدہوش ہونا۔ آیت زیر مطالعہ۔

سَكَّرَ (تفعیل) تَسْكِيْرًا : گلا گھونٹنا، روک دینا۔ ﴿اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا﴾ (الحجر:١٥) ''کچھ نہیں سوائے اس کے کہ باندھ دی گئیں ہماری نگاہیں۔''

## غ س ل

غَسَلَ۔ یَغْسِلُ (ض) غَسْلاً: کسی چیز کو پانی سے دھونا' میل کچیل دور کرنا۔

اِغْسِلْ (فعل امر): تو دھو۔ ﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ﴾ (المائدۃ:٦) ''جب بھی تم لوگ کھڑے ہو نماز کے لیے تو تم لوگ دھولو اپنے چہروں کو۔''

غِسْلِيْنٌ: دور کیا ہوا میل کچیل' زخموں کا دھوون۔ ﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ﴾ (الحاقۃ) ''اور کوئی کھانا نہیں ہوگا مگر زخموں کے دھوون میں سے۔''

اِغْتَسَلَ (افتعال) اِغْتِسَالاً: اہتمام سے دھونا' نہانا' غسل کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

مُغْتَسَلٌ (اسم المفعول جو ظرف کے معنی میں آتا ہے): نہانے کی جگہ' غسل خانہ۔ ﴿هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ﴾ (صٓ:٤٢) ''یہ ٹھنڈا کرنے والی نہانے کی جگہ ہے۔''

## ل م س

لَمَسَ یَلْمُسُ وَیَلْمِسُ (ن۔ض) لَمْسًا: (١) کسی چیز کو چھونا (٢) کسی چیز کو ڈھونڈنا۔ ﴿وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ﴾ (الجن:٨) ''اور یہ کہ ہم نے ٹٹولا آسمان کو۔''

لَامَسَ (مفاعلہ) مُلَامَسَةً: ایک دوسرے کو چھونا' مباشرت کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

اِلْتَمَسَ (افتعال) اِلْتِمَاسًا: اہتمام سے ڈھونڈنا' تلاش کرنا۔

اِلْتَمِسْ (فعل امر): تو تلاش کر۔ ﴿قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾ (الحدید:١٣) ''کہا جائے گا تم لوگ واپس جاؤ اپنے پیچھے پھر تلاش کرو نور کو۔''

## غ و ط

غَاطَ۔ یَغُوْطُ (ن) غَوْطًا: گڑھا کھودنا' کسی کو غوطہ دینا۔

غَائِطٌ (اسم الفاعل): غوطہ دینے والا۔ پھر استعارۃً رفع حاجت کی جگہ کے لیے بھی آتا ہے' یعنی بیت الخلاء' لیٹرین' باتھ روم' کیونکہ اس زمانہ میں بیت الخلاء کے لیے نشیبی زمین کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ آیت زیر مطالعہ۔

## م س ح

مَسَحَ۔ یَمْسَحُ (ف) مَسْحًا: کسی چیز پر ہاتھ پھیرنا' پونچھنا' مسح کرنا۔

اِمْسَحْ (فعل امر): تو مسح کر۔ آیت زیر مطالعہ۔

اَلْمَسِيْحُ (فَعِيْلٌ کا وزن): حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے' کیونکہ ان کے ہاتھ پھیرنے سے مریض اچھے ہو جاتے تھے۔

**ترکیب**: ''وَلَا جُنُبًا'' حال ہے اور ''لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ'' پر عطف ہے۔ ''عَابِرِيْ'' بھی حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصبی میں ہے اور مضاف ہونے کی وجہ سے اس کا نون اعرابی گرا ہوا ہے۔ ''مَرْضٰى'' سے ''مَاءً'' تک اِن کی شرط ہے اور ''فَتَيَمَّمُوْا'' جواب شرط ہے' جبکہ ''فَامْسَحُوْا'' اس کی وضاحت ہے۔

## ترجمہ:

| | |
|---|---|
| يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے وہ لوگو جو | اٰمَنُوْا : ایمان لائے |
| لَا تَقْرَبُوا : تم قریب مت جاؤ | الصَّلٰوةَ : نماز کے |
| وَ : اس حال میں کہ | اَنْتُمْ : تم |
| سُكٰرٰى : مدہوش ہو | حَتّٰى : یہاں تک کہ |
| تَعْلَمُوْا : تم جانو | مَا : اس کو جو |
| تَقُوْلُوْنَ : تم کہتے ہو | وَلَا جُنُبًا : اور نہ ہی ناپاک ہوتے ہوئے |
| اِلَّا : مگر | عَابِرِيْ سَبِيْلٍ : کسی راستے کے گزرنے والے ہوتے ہوئے |
| حَتّٰى : یہاں تک کہ | تَغْتَسِلُوْا : تم غسل کرلو |
| وَاِنْ : اور اگر | كُنْتُمْ : تم ہو |
| مَّرْضٰٓى : مریض | اَوْ عَلٰى سَفَرٍ : یا کسی سفر پر |
| اَوْ جَآءَ : یا آئے | اَحَدٌ : کوئی ایک |
| مِّنْكُمْ : تم میں سے | مِّنَ الْغَآئِطِ : بیت الخلاء سے |
| اَوْ لٰمَسْتُمُ : یا تم مباشرت کرو | النِّسَآءَ : بیویوں سے |
| فَلَمْ تَجِدُوْا : پھر تم لوگ نہ پاؤ | مَآءً : کوئی پانی |
| فَتَيَمَّمُوْا : تو تم تیمّم کرو | صَعِيْدًا طَيِّبًا : کسی پاک مٹی سے |
| فَامْسَحُوْا : تو ہاتھ پھیرو | بِوُجُوْهِكُمْ : اپنے چہروں پر |
| وَاَيْدِيْكُمْ : اور اپنے ہاتھوں پر | اِنَّ اللّٰهَ : بے شک اللہ |
| كَانَ : ہے | عَفُوًّا : بے انتہا درگزر کرنے والا |
| غَفُوْرًا : بے انتہا بخشنے والا | |

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

# بار بار گناہ اور بار بار استغفار کرنے والے

مدرّس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((اِنَّ عَبْدًا اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْهُ فَقَالَ رَبُّهٗ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ ، غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ، ثُمَّ مَکَثَ مَا شَاءَ اللّٰهُ ، ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا قَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ ، فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ ، غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ، ثُمَّ مَکَثَ مَا شَاءَ اللّٰهُ ، ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا قَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا آخَرَ فَاغْفِرْهُ لِیْ ، فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ ، غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ، فَلْیَفْعَلْ مَا شَاءَ )) (رواہ البخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے کسی بندے نے کوئی گناہ کیا' پھر اللہ سے عرض کیا: اے میرے مالک! مجھ سے گناہ ہوگیا' مجھے معاف فرمادے! تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو گناہوں کو معاف بھی کرتا ہے اور ان پر گرفت بھی کرسکتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کا گناہ بخش دیا اور اس کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد جب تک اللہ نے چاہا وہ بندہ گناہ سے رکا رہا' اور پھر کسی وقت گناہ کر بیٹھا' اور پھر اللہ سے عرض کیا: میرے مالک! مجھ سے گناہ ہوگیا تو اس کو بخش دے اور معاف فرمادے' تو اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا: میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو گناہ وقصور معاف بھی کرسکتا ہے اور پکڑ بھی سکتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کا گناہ معاف کر دیا۔ اس کے بعد جب تک اللہ نے چاہا وہ بندہ گناہ سے رکا رہا' اور کسی وقت پھر کوئی گناہ کر بیٹھا اور پھر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اے میرے مالک ومولیٰ! مجھ سے گناہ ہوگیا تو مجھے معاف فرمادے اور میرا گناہ بخش دے! تو اللہ تعالیٰ نے پھر ارشاد فرمایا: میرے بندے کو یقین ہے کہ اس کا کوئی مالک ومولیٰ ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور سزا بھی دے سکتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو بخش دیا' اب جو اس کا جی چاہے کرے۔''

استغفار دعا ہی کی ایک قسم ہے' یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی اور بخشش چاہنا۔ انسان فطرتاً کمزور ہے اور کوشش کے باوجود اس سے گناہ اور قصور سرزد ہو جاتے ہیں۔ اس طبعی کمزوری کا لحاظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو گناہوں کی بخشش کا فائدہ دیا ہے۔ اس فطری کمزوری کے سبب جب انسان سے گناہ کا کام ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرتا اور اپنے گناہ کی معافی چاہتا ہے۔ ایسا بندہ اللہ تعالیٰ کو اچھا لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا قصور معاف کر دیتا ہے۔

استغفار کا لازمی تقاضا توبہ ہے' یعنی گناہ کی بخشش مانگنے کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ

گناہ پر نادم ہو اور آئندہ کے لیے اس گناہ سے باز رہنے کا پختہ ارادہ کرے۔ خطا کا صدور ہر انسان سے ہو جاتا ہے' لیکن کسی انسان کو جب احساس ہو جاتا ہے کہ اس نے اللہ کی ناراضگی والا کام کیا ہے تو وہ اپنے پروردگار کے سامنے دست بستہ حاضر ہو کر توبہ کرتا اور اپنے قصور کی معافی چاہتا ہے' یہی استغفار ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ ایک بندے کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ اُس سے ایک گناہ ہو گیا تو اس نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے' مجھے معاف فرما دیجیے۔ اس پر ربّ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا میرے بندے کو پتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ کو معاف بھی کرتا ہے اور سزا بھی دے سکتا ہے؟ یہ انداز اللہ تعالیٰ کو پسند آتا ہے کہ بندے نے معافی کے لیے کسی غلط جگہ کا رخ نہیں کیا بلکہ سب کو چھوڑ کر غفّار الذّنوب کی طرف متوجّہ ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس سے پھر گناہ ہو جاتا ہے تو وہ پھر توبہ کرتا اور اللہ کے حضور استغفار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا میرے بندے کو پتا ہے کہ اُس کا ایک ربّ ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر سزا بھی دے سکتا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اسی طرح تیسری مرتبہ بھی گناہ کی معافی چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا اور اس کا گناہ بخش دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی فرماتا ہے میں نے اپنے بندے کو بخش دیا' اب جو اس کا جی چاہے کرے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے یہ کسی خاص شخص کا ذکر نہیں بلکہ ایک کردار کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے شمار بندے ایسے ہیں کہ جن سے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں اور وہ اس پر شرمندہ اور پشیمان ہو کر توبہ کرتے اور اللہ سے بخشش کی دعا مانگتے ہیں۔ سچے دل سے توبہ کر کے استغفار کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی کریمانہ معاملہ ہوتا ہے۔ بندہ بار بار اپنی توبہ توڑ بیٹھتا ہے' مگر جب وہ پختہ ارادے کے ساتھ پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بار بار اس کے استغفار کو قبول کرتا اور اسے معاف کر دیتا ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ استغفار کرے وہ اگر دن میں ستر مرتبہ بھی پھر وہی گناہ کرے تو وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوتا''۔ یہ ایسے بندے کے لیے ہے جو بے فکری' بے خوفی اور بے شرمی کے ساتھ گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور نہ وہ عادی مجرم ہے' بلکہ بشری تقاضے کے تحت اس سے قصور ہو جاتا ہے تو وہ فوراً اللہ کے حضور حاضر ہو کر مغفرت کی درخواست کرتا ہے اور اپنا قصور معاف کرا لیتا ہے۔ جب بندہ معافی کا خواست گار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ میرا بندہ میرے سوا اور کسی سے گناہ بخشوانے کے لیے رجوع نہیں کرتا بلکہ اس کو معلوم ہے کہ گناہ صرف میں ہی بخش سکتا ہوں۔ گویا اس کا توحید پر پُختہ ہونا اُس کے گناہ کی معافی کا سبب بن جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی بخشش کی کوئی حد نہیں اس لیے کسی بڑے سے بڑے گناہگار کے گناہ بخشنے میں بھی اسے کوئی دیر نہیں لگتی' بلکہ وہ تو ایسے بندوں کو پسند کرتا ہے جو گناہ ہو جانے پر استغفار کرتے اور معافی چاہتے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمؑ کا ہر بیٹا خطا کار ہے (یعنی ایسا کوئی نہیں جس سے کبھی کوئی خطا سرزد نہ ہوئی ہو) اور خطا کاروں میں وہ بہت اچھے ہیں (جو خطا اور گناہ کے بعد) سچی توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں''۔ سچی توبہ اور استغفار کی قبولیت میں تو ذرّہ برابر

بھی شک نہیں' کیونکہ اس طرح بندہ رب کریم کی شانِ غفاری کے سایہ میں آ جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر بالفرض تم سب لوگ کوئی گناہ نہ کرو تو اللہ کوئی اور ایسی مخلوق پیدا کرے گا جن سے گناہ بھی سرزد ہوں گے' پھر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کا فیصلہ فرمائے گا''۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے اس حدیث کا اپنی زندگی میں تذکرہ نہ کیا مبادا کم فہم لوگ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں اور گناہوں پر جری ہو جائیں۔ پھر اپنی وفات کے وقت کتمانِ حق کے خوف سے یہ حدیث بیان کر دی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو وہ بندے پسند ہیں جو بشری تقاضے کے تحت گناہ کر بیٹھتے ہیں مگر توبہ اور استغفار کے ذریعے وہ گناہ معاف بھی کرا لیتے ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی ہر صفت بے حد و حساب ہے اسی طرح اس کی صفت غفاریت بھی بے حساب ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے ابن آدم! مجھے پروا نہیں چاہے تیرے گناہ آسمان کے بادلوں تک جا پہنچیں اور پھر تو مجھ سے بخشش مانگے تو میں تجھے بخش دوں گا۔ اے ابن آدم! اگر تو میرے پاس زمین بھر خطائیں لے کر آئے اور مجھے اس حال میں ملے کہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو تو میں تیرے پاس اتنی ہی مغفرت کے ساتھ آؤں گا۔''

حدیث زیر مطالعہ میں آخری الفاظ فَلْيَفْعَلْ مَا شَاءَ سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ بخشش مانگنے والے کو گناہوں کی اجازت مل گئی ہے' بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو بندہ گناہ سرزد ہونے کے بعد سچے دل سے توبہ کر کے استغفار کرتا ہے تو وہ اپنا گناہ بخشوا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو بشارت دیتا ہے کہ اے میرے بندے! میں نے تیرا گناہ معاف کر دیا۔ اگر تجھ سے گناہ ہوتے رہے اور تو اسی انداز سے سچی توبہ کر کے استغفار کرتا رہا تو میں تیرے گناہ بخشتا رہوں گا۔

الغرض اس حدیث سے ایک نتیجہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ بخشش پوری اُمید کے ساتھ اللہ سے مانگی جائے۔ گناہ سے توبہ ندامت اور شرمندگی کے ساتھ ہو اور وہ گناہ پختہ ارادے سے چھوڑ دیا جائے۔ دوسرا نتیجہ یہ کہ انسان کبھی اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس نہ ہو۔ وہ تمام گناہوں کو بخشنے کا اختیار رکھتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾ (الزمر:۵۳)

تیسرا سبق اس حدیث سے یہ ملتا ہے کہ صرف زبان سے استغفر اللہ کا ورد کافی نہیں' گناہوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے۔ البتہ عین ممکن ہے کہ بندے سے پھر وہی گناہ سرزد ہو جائے اور پھر سچی توبہ اور استغفار کر کے معاف کرا لیا جائے۔ یہ بات تو ظاہر اور باہر ہے کہ جان بوجھ کر گناہ کا ارتکاب کرتے رہنا یا اور کسی گناہ کو مستقل طور پر اس خیال سے اختیار کرنا اور کرتے رہنا کہ بعد میں معاف کرا لیں گے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکا کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ تو دھوکا کھانے سے پاک اور منزّہ ہے۔ اور پھر کس شخص کو پتا ہے کہ اسے توبہ اور استغفار کا موقع ملے گا' کیونکہ زندگی کا خاتمہ تو کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ اس لیے گناہ کے صدور کے فوری بعد استغفار کرنا ضروری ہے۔

# ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ناقدانہ اور معتدل طرزِ فکر کا ایک مطالعہ

از قلم : محمد عمار خان ناصر☆

بیسویں صدی میں مسلم قومی ریاستوں کے ظہور نے حیاتِ اجتماعی کے دائرے میں مسلمان معاشروں کی تشکیلِ نو اور بالخصوص مذہب کے کردار کو اہلِ دانش کے ہاں غور وفکر اور بحث ومباحثہ کا ایک زندہ موضوع بنا دیا۔ اسلام چونکہ محض پوجا اور پرستش کا مذہب نہیں، بلکہ انسانی زندگی میں مخصوص اعتقادی واَخلاقی اَقدار اور متعیّن اَحکام وقوانین کی عمل داری کو بھی اپنا مقصد قرار دیتا ہے، اس لیے مذہب کے اجتماعی کردار کا سوال اپنے متنوّع پہلوؤں کے ساتھ ان مفکّرین کے غور وفکر اور مطالعہ وتحقیق کا موضوع بنا جو جدید تہذیبی رجحانات کے علی الرغم ریاست اور مذہب کے باہمی تعلق کو نہ صرف مضبوط دیکھنا چاہتے تھے، بلکہ ریاست کو خالص مذہبی ونظریاتی اساسات پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ اس نوع کے اہلِ فکر کی جدّوجہد اور خدمات کو درست تناظر میں دیکھنے کے لیے یہ نکتہ سامنے رہنا چاہیے کہ یہ سب حضرات بنیادی طور پر امّتِ مسلمہ کے زوال کو موضوع بناتے ہیں جو مغرب کے تہذیبی اور سیاسی استیلا کے نتیجے میں عالمِ اسلام پر مسلّط ہوا ہے اور جس نے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے اندازِ فکر، ترجیحات اور طرزِ زندگی کو ان خطوط سے بالکل مختلف خطوط پر استوار کر دیا ہے جس کی تعلیم ان کے دین نے دی ہے۔ کسی اجنبی تہذیب کے سامنے فکر واعتقاد اور تہذیب ومعاشرت کی سطح پر سرِ تسلیم خم کر دینا چونکہ خود داخلی سطح پر ایمان واعتقاد کی کمزوری اور فکری وعملی ترجیحات کی کجی کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے ان تمام اہل فکر کی توجہ فطری طور پر خود امتِ مسلمہ کے فکر وعمل کی اصلاح کی طرف مبذول ہوئی۔ اگرچہ ان سب کی فکری کاوشوں میں مغربی فکر وتہذیب کا حوالہ مسلسل پایا جاتا ہے اور اس کی فکری ونظریاتی اساسات کے تجزیہ وتنقید پر بھی انھوں نے بھرپور فکری توانائیاں صرف کی ہیں، تاہم اس ساری گفتگو کا مخاطب اصلاً مغربی ذہن نہیں، بلکہ مغربی اندازِ نظر کے اثرات کو قبول کرنے والے مسلمان ہی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا درست دکھائی دیتا ہے کہ ماضی قریب اور حال کی تمام احیائی تحریکیں، اپنے اندازِ نظر اور حکمتِ عملی کے تمام تر تنوّع کے باوجود، اُمتِ مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بازیابی کی کلید خود مسلمانوں کے فکر ونظر میں تبدیلی کو قرار دیتی ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا شمار ہمارے دور کے ان نامور اہل فکر میں ہوتا ہے جنھوں نے امتِ مسلمہ کو درپیش صورت حال، اس کے اسباب وعوامل اور اصلاحِ اَحوال کی حکمت عملی پر پوری آزادی، گہرائی اور

☆ مدیر ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

originlaity کے ساتھ غور وفکر کیا' اور ان کے غور وفکر نے جن نتائج تک انھیں پہنچایا' انھوں نے قدیم یا جدید اور روایتی یا غیر روایتی طبقات کی پسند یا ناپسند کا لحاظ کیے بغیر بلاخوف لومۃ لائم پوری جرأت کے ساتھ ان کا اظہار بھی کیا۔ ان کے نتائج فکر سے یقیناً اختلاف کیا جاسکتا ہے' لیکن اپنی حریتِ فکر اور آزادانہ اندازِ نظر کے لحاظ سے وہ بلاشبہ اقبال کے اس مصرعے کا مصداق تھے کہ: 'نے ابلہ مسجد ہوں' نہ تہذیب کا فرزند'۔ چنانچہ جہاں انھوں نے تہذیبِ مغرب کی فکری ونفسیاتی اساسات اور اس کے تباہ کن نتائج اور خاص طور پر مسلمان معاشروں میں اس تہذیب کے فکری وعملی اثرات کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے والے طبقات کو اپنے ناقدانہ تجزیوں کا موضوع بنایا' وہاں خود ان طبقات کے اندازِ فکر کی تنقید میں بھی انھوں نے کوئی رعایت نہیں برتی جو مغرب زدہ طبقے کے بالمقابل اسلام اور امتِ مسلمہ کی سربلندی کا جذبہ اور مسلمانوں کے قومی مفاد سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ ایک صاحبِ فکر خود جس حلقہ فکر سے تعلق رکھتا ہو اور بحیثیتِ مجموعی اس طبقے کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتا ہو' اس کے لیے خودتنقیدی کا یہ عمل بہت مشکل ہوتا ہے' چنانچہ سطحی سیاست کاروں کے برعکس' جو عوامی جذبات واحساسات کو محض سیاسی کھیل تماشے کے لیے استعمال کرنا جانتے ہیں' خودتنقیدی کی یہ ذمہ داری سنجیدہ' دیانت دار اور حقیقی طور پر امت کے خیرخواہ اہلِ دانش ہی انجام دے سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس نوع کے اصحابِ فکر کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن' جس کا تسلسل ان کے حلقہ فکر اور متوسلین کو ہر حال میں قائم رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے' یہی ہے' کیونکہ ان کے اندازِ فکر کے اس حرکی پہلو کو نظرانداز کر کے اگر مخصوص نتائج فکر تک اپنے آپ کو محدود کرلیا جائے تو اسی سے وہ تقلیدی جمود وجود میں آتا ہے جس سے خود یہ اصحابِ فکر زندگی بھر نبرد آزما رہے۔

اس تناظر میں' آج کی اس نشست میں' میں نے گفتگو کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمہ اللہ کے فکر ونظر کے متنوع اور گوناگوں پہلوؤں میں سے اسی خاص پہلو کو منتخب کیا ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کی مختلف تحریروں اور خطابات سے جمع کیے گئے کچھ منتخب اقتباسات پیش کروں گا جن میں مذہبی یا نیم مذہبی اندازِ فکر کے چند مخصوص پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان اقتباسات کا انتخاب اتفاقِ رائے یا تائید کے اصول پر نہیں کیا گیا' بلکہ اصل مقصد ڈاکٹر صاحب کے ناقدانہ زاویہ نظر کو واضح کرنا ہے' جو میرے نزدیک اختلاف کی گنجائش کے باوجود فی نفسہ ایک نہایت قابل قدر اور قابل تقلید چیز ہے۔ یہ کام مختصر وقت میں بالکل سرسری انداز میں ہی کیا جاسکا ہے' تاہم امید ہے کہ پیش نظر نکتے کو واضح کرنے کے لیے کسی حد تک مفید ہوگا۔

## اسلام میں عدلِ اجتماعی کا تصور اور روایتی فقہی اندازِ نظر

نفاذِ اسلام کے ضمن میں قائداعظم وعلامہ اقبال کے تصورات کے بالمقابل مذہبی طبقات کے تصورِ اسلام کی محدودیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

''مؤسسینِ پاکستان اقبال اور جناح کے اَفکار میں تو زیادہ زور اسلام کے نظامِ اجتماعی پر تھا' یعنی اسلام کا سیاسی' اقتصادی اور سماجی نظام (System of Social Justice as given by Quran) لیکن تحریک پاکستان کی' علماء ومشائخ نے جو حمایت کی تھی' ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اس خطے میں اسلامی قوانین اور اسلامی شریعت نافذ کی جائے۔..... یہ دونوں پہلو سامنے رکھیے جو ایک دوسرے سے قدرے

مختلف، لیکن درحقیقت لازم وملزوم ہیں۔ قائداعظم اور علامہ اقبال دونوں کے نزدیک اسلام کا نظامِ اجتماعی تھا جو انسان کو عدل دیتا ہے، جبکہ علماء ومشائخ کے نزدیک اسلامی قوانین وشریعت خصوصاً حدود وتعزیرات کا نفاذ تھا جو اس نظام کو سہارا دیتے ہیں۔'' (پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات وخدشات، ص ۱۸)

ڈاکٹر صاحب نے روایتی فقہی ذخیرے کے بعض مخصوص تصورات کو بھی اسی تناظر میں نقد وجرح کا موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر مزارعت کو جائز قرار دیے جانے سے اسلام کے معاشی مقاصد پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جیسے جیسے ملوکیت اور جاگیرداری کی جڑیں زمین میں گہری اترتی گئیں، حالات کے جبر اور ''نظریہ ضرورت'' کے عمل دخل کا ظہور ہوا اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگردِ رشید قاضی ابویوسفؒ نے..... امام صاحبؒ کے دوسرے شاگرد امام محمدؒ کے اتفاقِ رائے کے ساتھ مزارعت پر کچھ شرائط عائد کر کے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ بھی دے دیا۔ بعد میں وہ شرائط تو طاقِ نسیاں کے حوالے ہوگئیں اور پورے عالمِ اسلام میں ''مزارعت'' شیرِ مادر کی مانند حلال وطیب ہوگئی اور اس طرح شہنشاہیت اور جاگیرداری کو دوام واستحکام حاصل ہوگیا۔'' (اسلام میں عدلِ اجتماعی کی اہمیت، ص ۴۲، ۴۳)

''سو ڈیڑھ سو برس بعد جبکہ ملوکیت بھی اپنی پوری شان اور کروفر کے ساتھ جلوہ گر ہو چکی تھی اور ''قرون مشہود لہا بالخیر'' (یعنی وہ اَدوار جن کے خیر کے حامل ہونے کی گواہی خود آنحضور ﷺ نے دی ہے) کا زمانہ بھی بیت چکا تھا، علمائے اسلام اور فقہائے کرام کا حالات کے جبر سے متاثر ہو جانا ہرگز نہ بعید از قیاس ہے نہ ان کے لیے موجبِ توہین۔'' (اسلام میں عدلِ اجتماعی کی اہمیت، ص ۴۶)

فقہ اسلامی کی تشکیل میں اس دور کے جو مخصوص تمدنی حالات اور ضروریات کارفرما رہی ہیں، اس کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے فقہائے اسلام کے اخذ کردہ مخصوص نتائجِ فکر کی پابندی کے بجائے قرآن وسنت سے براہِ راست اخذ واستنباط کی ضرورت واہمیت کو بھی بڑی تاکید سے واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایسے اصحابِ علم ودانش آگے بڑھیں جو کتاب وسنت کے نصوص کی پابندی کے عزمِ مصمم کے ساتھ ساتھ صرف سلف کی اجتہادی آراء کے مقلدِ جامد بن کر نہ رہ جائیں، بلکہ شریعت کے اصل مقاصد واَہداف کو بھی پیش نظر رکھ سکیں اور جہد وجہاد کے جذبے سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ قیاس واجتہاد اور اس کے ضمن میں مصالح مرسلہ اور مفادِ عامہ کو بھی ملحوظ رکھ سکیں۔'' (اسلام میں عدلِ اجتماعی کی اہمیت، ص ۲۹)

''ایک مجلس کی تین یا تین سے بھی زائد طلاقوں کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ جو ایک رعایت اور نرمی فرمایا کرتے تھے، اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحتِ امت کے پیش نظر اپنے ایک اجتہادی فیصلہ سے ختم کر دیا تو اس پر تو اہل سنت کے چاروں مکاتبِ فقہ کا اس درجہ عزم بالجزم کے ساتھ اصرار ہے کہ کسی بھی صورت میں نبی اکرم ﷺ کی رعایت کو دوبارہ جاری کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔'' (اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت، ص ۴۵)

## احیائی تحریکوں کی یک رخی فکری ترجیحات

بیسویں صدی کی مسلم احیائی تحریکوں کے ہاں اسلام کو بطور ایک اجتماعی نظام کے نمایاں کرنے کی کوشش

اس انداز سے ہوئی ہے کہ دین کا روحانی اور باطنی پہلو مقدم الذکر پہلو کا خادم اور تابع قرار پا کر بڑی حد تک دب گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پہلو کی بجا طور پر نشان دہی کی ہے' چنانچہ لکھتے ہیں:

''ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعہ اسلام اسی مغربی نقطہ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادے اور حیاتِ اُخروی پر حیاتِ دُنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعیاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے' لیکن انھیں کچھ زیادہ درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیۃً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دُنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔ ..... اسی نقطہ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (state) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت' اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المؤمنین ہے' نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفسِ انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ "قُرَّةُ عَينِي فِي الصَّلٰوة" کی کیفیت پیدا ہو سکے' ناپید ہے۔ ..... زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیے کا ذریعہ ہے' اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (self control) کی مشق و ریاضت ہے' لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں 'حجاب' محسوس ہوتا ہے کہ یہ روح کی تقویت کا سامان اور جسدِ حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے۔ .... اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے ''خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری'' کی تنظیم ہوتی ہے' لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا! ..... کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاحِ انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاحِ اُخروی اور فلاحِ دُنیوی دونوں شامل ہیں' لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیاتِ دُنیوی پر مرکوز ہیں' لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک ''سیاسی و عمرانی نظام'' (Politico-Social System) بن کر رہ گیا۔ ..... اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع 'مذہبی' سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور 'دینی' سے زیادہ 'دنیوی' ہیں اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشرتی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے۔ .... یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ ہی یہ یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا۔'' (نشاۃ ثانیہ ص ۱۱ تا ۱۷)

ڈاکٹر صاحب نے غلبۂ دین کا مقصد حاصل کرنے کے لیے ان احیائی تحریکوں کی عجلت پسندانہ حکمت عملی پر بھی تنقید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں' بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں' اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصورِ دین ان کی پشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کیے

ہوئے ہے۔..... یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِعمل ہیں اور ملّتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابل ذکر حصہ ان کے زیر اثر آیا ہے' لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہوسکی' بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں اخوان المسلمون کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُوَلِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برصغیر کی تحریک اسلامی تو اس کا جزواعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریک جمہوریت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انھوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتد بہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور 'ترقی پسند' عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آ گئی' لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہ راست نتیجہ ہے ان کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعہ اسلام کے نقص کا۔'' (نشأۃِ ثانیہ' ص ۱۱ تا ۱۷)

## ہندو مسلم منافرت کی تاریخی بنیادیں

برصغیر میں ہندو مسلم منافرت کا جو مسئلہ اس وقت اس پورے خطے کے امن و استحکام کے لیے ایک بہت بڑے چیلنج کی صورت اختیار کر چکا ہے' تاریخی بنیادوں پر اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یک طرفہ طور پر ہندوؤں کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے خود مسلمانوں کو بھی اپنے گریبان میں جھانکنے کی دعوت دی ہے' چنانچہ مسلمان بادشاہوں کے طرزِ حکومت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''بدقسمتی سے ہمارے ملک کے بعض دانش وروں نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نفرت کے ''چلتے ہوئے جھکڑ'' اور بداعتمادی کی ''اٹھتی ہوئی آندھی'' کے ایک سبب کو اس درجہ اچھالا ہے اور اس شدت کے ساتھ تحریر و تقریر کا موضوع بنایا ہے کہ دوسرے جملہ عوامل نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ عوام کے اَذہان میں اس پوری صورت حال کے واحد سبب کی حیثیت صرف ہندوؤں کی عمومی چھوت چھات' برہمنوں کے سامراجی مزاج اور بنیوں کی چاپلوسانہ عیاری کی ذہنیت کو حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ ایک جانب یہ پہاڑ جیسی عظیم حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی کہ ہندو معاشرہ صرف برہمنوں اور بنیوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں راجپوت اور شودر بھی موجود ہیں جو اپنا اپنا جداگانہ مزاج رکھتے ہیں۔ مزید برآں خود برہمنوں اور بنیوں میں بھی ''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد — خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد'' کے مصداق ہر مزاج اور کردار کے لوگ موجود ہیں' اور دوسری جانب ان دو اہم عوامل سے تو کامل ذہول ہو گیا جن میں سے ایک کا تعلق ماضی بعید اور خود مسلمانوں کے اپنے کردار سے ہے اور دوسرے کا ماضی قریب اور انگریزوں کے کردار سے!

ان میں سے مقدّم الذکر سے صرفِ نظر اور غضِّ بصر کا معاملہ تو

''وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا''

کے عین مطابق ہے‘ اس لیے کہ اس تلخ حقیقت کا اعتراف بہت مشکل ہے کہ خود ہم مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی ’’ہزار سالہ‘‘ حکومت کے دوران اکثر و بیشتر وہی ’’اَقوامِ غالب‘‘ والا کردار اختیار کیا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور نہ صرف یہ کہ اپنے ان فرائض کو تو سرے سے ادا ہی نہیں کیا تھا جو اُمتِ مسلمہ اور اُمتِ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتے تھے‘ یعنی اللہ کے پیغام کی دعوت و تبلیغ اور اسلام کے عادلانہ نظام زندگی اور دین حق کے نظام عدل وقسط کے قیام کے ذریعے خلق خدا پر اللہ کی رحمانیت و رحیمیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا عملی مظاہرہ اور اس طرح اللہ اور رسول ﷺ کی جانب سے ہندوستان میں بسنے والوں پر اِتمامِ حجت‘ بلکہ بہت سے حکمرانوں نے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ قائم رکھنے کے علاوہ ذاتی عیاشی اور بوالہوسی کے وہ جملہ انداز اختیار کیے جو ہمیشہ سے ملوکیت اور بادشاہی کے لوازم میں سے رہے ہیں‘ اور ان سب کی بنا پر ہندوؤں میں عمومی طور پر وہ انتقامی جذبہ موجود تھا جو سقوطِ ڈھاکہ کے حادثہ فاجعہ کے موقع پر ع ’’نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں‘‘ کے مطابق فتح مندی کی سرمستی میں پنڈت موتی لال نہرو جیسے وسیع المشرب انسان کی پوتی اور جواہر لال نہرو جیسے سیکولر اور سوشلسٹ مزاج کے حامل شخص کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ سے ظاہر ہو گیا کہ ’’ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے!‘‘ (پاک بھارت تعلقات‘ ص ۱۲‘ ۱۴۳)

پاکستان اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کی آئیڈیل صورت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے دونوں سب سے بڑے عَلَم برداروں‘ یعنی مصوّر و مفکّرِ پاکستان علامہ اقبال اور معمار و مؤسّسِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے تقسیم کے بعد کے حالات کے ضمن میں جو خواب دیکھے تھے‘ وہ اس صورت حال کے بالکل برعکس تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں قائداعظم نے تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کی تھی کہ ’’بھارت اور پاکستان کے تعلقات ایسے ہی ہوں گے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مابین ہیں‘‘، لیکن علامہ اقبال نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے خطبہ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء) میں یہاں تک فرما دیا تھا کہ ’’ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع مسلم ریاست ہر نوع کی جارحیت کے مقابلے میں ہندوستان کے دفاع کا فریضہ بہترین طور پر سرانجام دے گی‘ خواہ وہ جارحیت نظریات کی ہو خواہ ہتھیاروں کی۔‘‘ (پاک بھارت تعلقات‘ ص ۲۸)

## پاک بھارت تعلقات اور مسئلہ کشمیر

ڈاکٹر صاحب نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے اختیار کی جانے والی حکمت عملی پر بھی تنقید کی اور ہمارے ہاں پائے جانے والے غالب لیکن جذباتی طرز فکر کے برعکس مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے جنگ کے راستہ کو عملاً غیر مؤثر اور غیر نتیجہ خیز قرار دیا۔ فرماتے ہیں:

’’سب سے پہلے جنگ کو لیجیے جس کی آج کل بار بار دہائی دی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ فی الواقع اور خصوصاً بحالاتِ موجودہ کوئی قابل عمل حل ہے؟ کیا ہم جنگی صلاحیت کے اعتبار سے بھارت کے مقابلے میں آج کی نسبت ۱۹۶۵ء میں کہیں زیادہ بہتر حالت میں نہیں تھے؟ پھر اگر اُس وقت کامیابی

حاصل نہیں ہو سکی تھی تو آج اس کی کتنی امید کی جا سکتی ہے؟

مسلمانانِ کشمیر پر بھارت کی ننگی جارحیت اور بے پناہ ظلم و بربریت کے خلاف پاکستان کی جانب سے کھلم کھلا اعلانِ جنگ صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ ہمیں اپنے موقف کے مبنی برحق و انصاف ہونے کے ساتھ ساتھ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۰ کے ان اَلفاظِ مبارکہ کے مطابق کہ: ﴿اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ﴾ یعنی ''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا!'' اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا یقین بھی حاصل ہوتا' جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سودی معیشت کے نظام کو جاری رکھنے کے باعث خود ہی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں' لہٰذا فرمانِ نبوی "فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ" یعنی ''ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟'' کے مطابق ہمیں اللہ کی نصرت و تائید کی امید کیسے ہو سکتی ہے! بنابریں لے دے کر سارا معاملہ صرف مادّی اَسباب و وسائل کی کمیت اور کیفیت کا رہ جاتا ہے جس کا تقابلی جائزہ اور موازنہ آئے دن اخبارات کی زینت بنتا رہتا ہے۔''

''رہا مسلمانانِ کشمیر کا سرفروشانہ اور بے مثال جہادِ حریت تو اس کے ضمن میں بھی جذبات سے ہٹ کر عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ کسی کھلم کھلا اور ٹھوس بیرونی امداد کے بغیر آخر وہ اسے حکومتِ پاکستان کی صرف اَخلاقی اور سفارتی مدد اور بعض نجی اداروں کی جانب سے چوری چھپے اور وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرہ کے بقدر امداد کے بل پر کب تک جاری رکھ سکیں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی بہت سے حلقوں' بالخصوص مذہبی گروہوں کی جانب سے عوام کو بہت بڑے بڑے مغالطے دیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اوّلاً جہادِ افغانستان کا حوالہ دیا جاتا ہے' حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس معاملے میں ایک سپر پاور کی کھلم کھلا' اعلانیہ اور فیصلہ کن مالی اور جنگی مدد حاصل تھی (جس کی بہتی گنگا میں خود پاکستان کے بہت سے مقتدر افراد اور مذہبی جماعتوں نے خوب خوب ہاتھ دھوئے) لہٰذا کشمیر کے معاملے میں افغانستان کا حوالہ قیاس مع الفارق کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (پاک بھارت تعلقات' ص ۳۶' ۳۷' ۳۸)

جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور میں کشمیر میں خفیہ دراندازی کی جو پالیسی شروع کی گئی اور جسے بعد میں حالات کے جبر کے تحت بڑی حد تک ترک کر دینا پڑا' اس کے نتائج و مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

''جس جہاد کو ہم چودہ سال سے سپانسر کر رہے تھے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ قرار دے رہے تھے' اس سے بھی ہم نے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کا ردِّعمل کشمیریوں میں یہ ہوا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان نے ہم سے دھوکہ کیا ہے' اس نے ہم کو مروایا ہے۔ میں جہاد کے نام پر کشمیر میں خفیہ مداخلت کا ہمیشہ سے مخالف تھا۔ اب میں بڑی تلخ بات کہہ رہا ہوں کہ پاکستان نے کشمیریوں سے ۱۹۶۵ء کا بدلہ لیا ہے۔ پاکستان نے ۱۹۶۵ء میں اپنے بہترین کمانڈوز کو اس توقع پر کشمیر میں داخل کر دیا تھا کہ کشمیری مسلمان مدد کریں گے' لیکن کشمیریوں نے کوئی حمایت نہیں کی اور وہ تقریباً سارے کے سارے شہید ہو گئے۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ بھارت پلٹ کر لاہور پر حملہ آور ہو گیا اور ہماری ساری کوشش ناکام ہو گئی۔ کشمیریوں کے جہادِ حریت میں اگرچہ پاکستان سے بھی بہت سوں نے وہاں جا کر جانیں دی ہیں' لیکن مصائب کا اصل پہاڑ تو

کشمیریوں پر ٹوٹ رہا ہے۔ عصمت دری تو ان کی عورتوں اور بیٹیوں کی ہوئی ہے' انھی کے گھروں کو مسمار کیا گیا ہے' انھی کی آبادیاں تھیں جو تھوک کے حساب سے جلادی گئیں اور انھی کی دکانیں ختم ہوئی ہیں۔ میرے نزدیک پاکستان نے کشمیریوں سے گویا ۱۹۶۵ء کا بدلہ لیا ہے' جبکہ انھوں نے پاکستان کی حمایت نہیں کی تھی۔''
(پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات وخدشات' ص ۳۳)

## جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کا غلط استعمال

عالم اسلام کے طول وعرض میں مغرب اور مغرب زدہ حکمران طبقات کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے 'جہاد' کی اصطلاح اپنی اثر انگیزی اور عملی افادیت کی وجہ سے بڑے پیمانے پر استعمال کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے بھی اختلاف کیا ہے' چنانچہ فرماتے ہیں:

''ایک دوسری چیز جس نے میرے نزدیک جلتی پر تیل کا کام کیا ہے اور پھر اس کی وجہ سے اصل بدنامی مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے' یہ مغالطہ ہے کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے' وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس غلط فہمی کے بدترین نتائج نکلے اور اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کو بری طرح بدنام کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ہمارے دورِ ملوکیت میں بادشاہ جو جنگیں کرتے تھے' ان کا محرک ان کی ہوسِ ملک گیری ہوتی تھی تاکہ بڑے سے بڑے محل بنا سکیں اور زیادہ سے زیادہ محصولات (revenues) اکٹھے ہو سکیں' لیکن ان جنگوں کو بھی جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا۔ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں اس مقدس اصطلاح کو تو بدنام ہونا ہی تھا۔

اس ضمن میں تازہ ترین مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ اسی (بیسویں) صدی کے وسط یعنی پچاس کی دہائی میں الجزائر میں فرانس سے آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ حصولِ آزادی کے لیے مسلمانوں کی جنگ ایک جائز جنگ ہے' مگر آزادی کی ہر جنگ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے' لیکن الجزائر کی اس جنگ آزادی کو جہاد فی سبیل اللہ کا نام دے دیا گیا۔..... اس ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا نتیجہ کیا نکلا؟ جب وہ جہاد کامیاب ہو گیا تو وہاں ایک سوشلسٹ ریاست وجود میں آ گئی۔ عجیب بات ہے کہ جو درخت آم کا تھا' اس پر برگ وبار کسی اور شے کے آ گئے۔ درحقیقت وہ جنگِ آزادی تھی' جہادِ حریت تھا' جہاد فی سبیل اللہ نہیں تھا۔ چنانچہ کامیابی کی صورت میں وہاں کے ایلیٹ طبقہ کے اَذہان' فکر اور نظریات کے مطابق نظام بن گیا۔

یہی حال ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں ہوا۔ افغانستان میں جو جنگ لڑی گئی' وہ بھی بنیادی طور پر جہادِ حُریت یعنی آزادی کی جنگ تھی۔ اس میں اصل زور اس وقت آیا جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ اس موقع پر تمام علماء بھی اٹھ کھڑے ہوئے' اس لیے کہ ہمارے فقہی تصورت کی رو سے بھی کسی مسلمان ملک پر کسی غیر مسلم حکومت کی فوجیں حملہ آور ہو جائیں تو پھر دفاع فرضِ عین ہو جاتا ہے' لہٰذا اس جذبے سے سرشار ہو کر پوری قوم اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے کھڑی ہو گئی۔ ہم نے اس پر بھی جہاد فی سبیل اللہ کا لیبل دے دیا اور دنیا بھر میں اس کا ایسا ڈنکا بجا کہ جذبہ شہادت سے سرشار نوجوان پوری دنیا سے کھنچ کر چلے آئے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے دل میں وہی جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ تھا' لیکن اس کی اصل کیفیت اور نوعیت تو جہادِ حریت کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روسی افواج افغانستان سے نکل گئیں اور آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جہاد فی سبیل اللہ کا یہ نتیجہ کبھی نہیں ہو سکتا۔'' (جہاد فی سبیل اللہ' ص ۶' ۷)

## پُرتشدد حکمتِ عملی کے مضرات

یہ بات نہیں کہ ڈاکٹر صاحب دینی مقاصد کے لیے قوت' زورِ بازو اور مسلّح جدّوجہد کے جواز کے قائل نہیں۔ وہ نہ صرف اس کے قائل بلکہ داعی ہیں' یہاں تک کہ انھوں نے اہلِ سنّت کے ہاں پائے جانے والے اس عمومی تصور سے بھی اختلاف کیا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے خلاف مسلّح بغاوت کسی حال میں جائز نہیں' تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلّح جدّوجہد کی کامیابی کے لیے مطلوبہ شرائط اور خاص طور پر ایسے کسی بھی اقدام کے عملی نتائج کو ملحوظ رکھنے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں' اور اسی تناظر میں انھوں نے موجودہ حالات میں اس طریقے کو اختیار کرنے والے عناصر کی تائید نہیں کی۔ فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے ایک خاص طبقے میں ایک خیال پیدا ہوا کہ ہمارا بھی تو ایک نظام ہے۔ یہ انگریز کا لایا ہوا بھی ایک نظام تھا' فرانسیسیوں کا دیا ہوا نظام بھی ایک نظام تھا اور ہمارا بھی ایک نظام ہے' ہم کیوں نہ اس کو نافذ کر دیں۔ یہ اصل میں اس آزادی کا ایک ثمرہ تھا کہ مسلمانوں میں ایک خود آ گاہی پیدا ہوئی اور انھوں نے اسلام کو بطور ایک دین کے سمجھا' لہٰذا احیائی تحریکیں ابھریں۔ انڈونیشیا میں مسجومی پارٹی' انڈو پاک میں جماعتِ اسلامی' ایران میں فدائین' عرب دنیا میں الاخوان المسلمون جیسی تحریکیں ابھریں۔ یہ ساری تحریکیں اس لیے اٹھیں کہ اسلام دین ہے اور دین اپنا غلبہ چاہتا ہے' ہمیں دین کو غالب کرنا ہے۔

لیکن بعض عوامل کی وجہ سے ان تحریکوں کو آج تک کہیں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ .... ان مسلمان تحریکوں نے طریق کار غلط اختیار کیا۔ دنیا میں اسلام ایک نظام کی حیثیت سے حضور ﷺ نے برپا کیا تھا اور یہ دوبارہ برپا ہوسکتا ہے تو صرف حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق ہوسکتا ہے۔ انھوں نے سمجھا وہ تو آؤٹ آف ڈیٹ ہے' پرانا ہے' لہٰذا الیکشن میں حصہ لے کر اس سے اسلام نافذ کریں گے۔ اس میں ناکامی ہوئی تو گولی چلانی شروع کر دی کہ فلاں فلاں کو مار دو۔ چنانچہ سادات کو قتل کر دیا گیا' سادات گیا تو حسنی مبارک آ کر براجمان ہو گیا (چند روز قبل میرے پاس ایک نوجوان آیا کہ میرا دَم گھٹ رہا ہے' میں چاہتا ہوں کہ پرویز مشرف کو قتل کر دوں۔ میں نے کہا تمہارا دماغ خراب ہے؟ تم ایک پرویز کو قتل کرو گے' کوئی اور پرویز آ کر بیٹھ جائے گا' فائدہ کیا ہوگا؟) تو کہاں تبدیلی ہوئی ہے؟ فوجی حکومت کے ذریعے سے کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟ اس اعتبار سے اس غلط طریق کار نے ان تحریکوں کو کہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ..... دینی تحریکوں کا طریق کار غلط ہے۔ انھوں نے ballot یا bullet کا راستہ اختیار کیا۔ یہ دونوں راستے غلط ہیں اور یکساں غلط ہیں۔''
(موجودہ حالات میں اسلام کا مستقبل' ص ۳۳' ۳۴' ۳۵)

''آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ طریق انقلاب واضح ہو جائے۔ آج مسلمانوں میں جذبے کی کمی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگ جانیں دے رہے ہیں۔ اپنے جسموں سے بم باندھ کر اپنے جسموں کو اڑا رہے ہیں۔ کشمیر کے اندر جو جذبہ ابھرا' اسے پوری دنیا نے دیکھ لیا۔ کشمیریوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ تو لڑنے والی قوم ہے ہی نہیں' اب اس کے اندر جان پیدا ہو چکی ہے۔ پاکستان سے جا کر کتنے لوگوں نے وہاں پر جامِ شہادت نوش کر لیا۔ لیکن اسلامی انقلاب کا طریق کار یہ نہیں ہے۔ اس سے کہیں کامیابی نہیں

ہوگی۔ اس طریقے سے آپ صرف اپنا غصہ نکال سکتے ہیں۔ آپ نے جا کر افریقہ میں امریکہ کے دو سفارت خانوں کو بم سے اڑا دیا' اس سے امریکی تو دس پندرہ مرے' جبکہ ۲۰۰ وہاں کے لوکل افریقی مر گئے۔ فائدہ کیا ہوا؟ بس یہی کہ آپ نے اپنا غصہ نکال لیا۔ تو ان طریقوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' (ص ۳۱)

''اگر ہم مشتعل ہو کر اسلحہ اٹھائیں تو کس کے خلاف اٹھائیں گے؟ بری افواج یا ایئر فورس کے خلاف؟ کیا ہماری ماضی کی حکومتوں نے بلوچستان میں دو مرتبہ ایئر فورس استعمال نہیں کی؟ کیا ایئر فورس کے ذریعے سے حافظ الاسد نے ایک دن میں ہزاروں اخوان ختم نہیں کر دیے تھے اور ان کا مرکز بمباری کر کے تباہ و برباد نہیں کر دیا تھا؟ تو آج مقابلہ بہت غیر مساوی (unequal) ہے۔.... جنگ اگرچہ جائز ہے' لیکن موجودہ حالات میں عملاً ممکن نہیں ہے۔ آج کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یک طرفہ جنگ ہی موزوں لائحہ عمل ہے۔'' (ص ۲۹' ۳۰)

---

ان چند اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم غلبہ اسلام کے مقصد کے ساتھ ایک والہانہ وابستگی رکھنے کے باوجود اس ضمن میں کی جانے والی جدّوجہد پر نقد و نظر کی ضرورت سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس پورے عمل پر مسلسل ناقدانہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں احیائے اسلام صرف ایک جذباتی خواہش کا عنوان نہیں جو ان تحریکوں کی غیر حکیمانہ ترجیحات سے صرفِ نظر کرنے پر آمادہ کر دے' بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے احیاء اور امت مسلمہ میں فکری انقلاب کی دعوت لے کر اٹھنے والی یہ تمام تحریکیں بہرحال انسانی بصیرت اور اجتہاد ہی کی مرہونِ منت ہیں اور نتیجتاً ان تمام کمزوریوں اور نقائص کی زد میں ہیں جن سے انسانی فکر کبھی کُلّی طور پر مبرا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی تحریکوں کے ہاں فکری و عملی ترجیحات کے لحاظ سے Trial and error کے انداز کا ایک ارتقاء پایا جاتا ہے' اور شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ منزل تو دور کی بات ہے' ابھی تک ان کے ہاں جادۂ منزل کی تعیین کے حوالے سے بھی مجموعی اعتبار سے کوئی یکسوئی نہیں پائی جاتی۔ کہیں ہدف کی تعیین میں غلطی ہوگئی ہے' کہیں مؤثر حکمتِ عملی وضع کرنے میں کوتاہیٔ فکر مانع ہوگئی ہے' کہیں طولِ مسافت نے صبر و حوصلہ کا دامن ہاتھ سے چھڑوا دیا ہے' اور کہیں پڑاؤ کے مقامات کو منزل یا منزل کا متبادل سمجھ کر وہیں ڈیرہ ڈال لیا گیا ہے۔ اس صورت حال کا ایک لازمی تقاضا یہ بنتا ہے کہ خود ان احیائی تحریکوں کے اندازِ فکر' ترجیحات' حکمت عملی اور کارکردگی کو کڑی تنقید کی کسوٹی پر مسلسل پرکھا جاتا رہے اور اس قافلے کو سوئے منزل رواں دواں رکھنے کے لیے فکرِ تازہ کی حُدی کسی انقطاع کے بغیر سنائی جاتی رہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے حصے کی ذمہ داری ادا کر کے دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں۔ اب یہ ان کے قائم کردہ حلقۂ فکر کی ذمہ داری ہے کہ وہ پورے شعور' بصیرت اور استقامت کے ساتھ اس روایت کے تسلسل کو قائم رکھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعض دوسری اصلاحی و احیائی تحریکوں کی طرح ایک فکری کیمپ کے ساتھ وابستگی کا احساس رفتہ رفتہ اتنا غالب آ جائے کہ حریتِ فکر اور خود تنقیدی کی جگہ سکوت و اغماض لے لیں اور نقائص اور کمزوریوں کی جرأت مندانہ نشان دہی کی جگہ پردہ پوشی بلکہ بعض صورتوں میں حمیتِ جاہلیہ کا رویہ پروان چڑھنے لگے۔

اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَکَ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَکَ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَھُمْ۔ آمین!!

# ’وہم‘ سے ’علم‘ تک

## ضعیف روایت کے صالح یا حسن بننے کے قرائن وشواہد

حافظ محمد زبیر

علمِ حدیث میں خبر یا حدیث کی تین بنیادی قسمیں ہیں: (۱) خبر صحیح وحسن (۲) خبر ضعیف (۳) خبر موضوع۔ خبر صحیح وحسن وہ خبر ہے جو اتفاقی طور پر اہلِ علم کے ہاں دینی مسائل میں قابلِ احتجاج ہے‘ جبکہ موضوع روایت یا خبر بالاتفاق نا قابلِ احتجاج ہے۔ ضعیف روایت کی متفرق اقسام اور مختلف احوال میں حجیّت کے بارے میں اہلِ علم کے ہاں تفصیل ہے۔ زیرِ نظر مقالہ ایک ضعیف روایت کے حسن یا قابل احتجاج بن جانے کی شرائط یا احوال و کیفیات کے بارے میں ہے کہ کن شرائط‘ قرائن یا اصول و کیفیات کی روشنی میں ایک ضعیف روایت قوت پکڑ کر قابل احتجاج یا حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ آسان الفاظ میں موضوع روایت کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو مردہ ہو اور اس میں حیات کے امکانات بھی ختم ہو چکے ہوں‘ جبکہ ضعیف روایت کی مثال ایک بیمار شخص کی سی ہے جسے بعض حالات و کیفیات میں صحت کی امید ہوتی ہے۔ پس زیرِ نظر مقالہ ان کیفیات اور احوال سے بحث کرتا ہے جو اہلِ علم کے ہاں ایک ضعیف روایت کو صالح یا حسن بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

دین و دنیا میں عام طور پر کسی بھی علم کے حصول کے لیے معتبر بنیادی ذرائع صرف دو ہی ہیں:

**(۱) براہِ راست مشاہدہ وحواسِ خمسہ (five senses) سے حاصل شدہ علم**

**(۲) خبر سے حاصل شدہ علم**

پہلا ذریعہ سائنس اور اہلِ مغرب کے ہاں اصل اور معتبر ذریعہ شمار ہوتا ہے‘ اگرچہ وہ دوسرے ذریعہ کو بھی استعمال کرتے ہیں‘ مثلاً بازار میں جاتے ہوئے آپ نے دیکھا کہ ایک شخص کو سرِ عام کچھ افراد نے قتل کر دیا ہے‘ اب آپ کو اس شخص کے قتل ہونے کا علم براہِ راست مشاہدے سے ہوا ہے۔

دوسرا ذریعہ اہلِ دین و مذہب کے ہاں بنیادی ذریعہ شمار ہوتا ہے‘ اگرچہ وہ پہلے ذریعہ سے بھی حجت پکڑتے ہیں۔ درج بالا مثال میں یہ بھی ممکن ہے کہ آپ جائے وقوعہ پر موجود نہ ہوں اور آپ کو متعلقہ شخص کے قتل کی خبر مل جائے۔ یہ خبر بعض اوقات ایک شخص کے ذریعے پہنچتی ہے اور بعض اوقات دو‘ تین‘ چار یا ایک بہت بڑی تعداد کے ذریعے۔ بعض اوقات اس اطلاع کے آپ تک پہنچانے والے قابل اعتماد یا متقی و پرہیزگار یا صادق ہوتے ہیں‘ جبکہ بعض صورتوں میں یہ ناقلین نا قابل اعتماد یا جھوٹے یا مشکوک ہوتے ہیں۔ مخبرین کی تعداد یا اوصاف کیسے ہی کیوں نہ ہوں‘ دنیا اس کو خبر ہی کہتی ہے۔

حصولِ علم کے مذکورہ بالا ذرائع کے علاوہ دو اور ذرائع بھی بہت معروف ہیں:

**(۳) وحی والہام یا کشف ووجدان**

**(۴) عقل**

انبیاء علیہم السلام پر نازل کی جانے والی وحی بھی اللہ ہی کی طرف سے ایک خبر ہوتی ہے۔ اکثر اوقات یہ وحی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے بطورِ خبر نازل ہوتی تھی' جبکہ بعض اوقات یہ وحی خواب کی صورت میں بھی ہوتی تھی۔ کسی نبی کا خواب بھی مشاہدہ وخبر ہی کی ایک ملی جلی قسم ہے' جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کر رہے ہیں' اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خواب میں ذبح کرتے دیکھا۔ اسی طرح بعض اوقات ایک عام شخص کو بھی بذریعہ خواب کسی بات کا علم ہو جاتا ہے جسے 'رؤیا صادقہ' یا 'مبشرات' کہا جاتا ہے' لیکن ایک نبی اور ایک عامی کے خواب میں اصل فرق یہ ہے کہ نبی کا خواب دوسروں کے حق میں بھی وحی وحجت کا درجہ رکھتا ہے' جبکہ ایک عامی کا خواب خود اس کے لیے تو کسی اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے لیکن دین میں کسی دوسرے شخص کے لیے کوئی شرعی دلیل نہیں بن سکتا۔

انبیاء کے لیے علم کے حصول کی ایک خاص شکل 'الہام' بھی ہے' یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی نبی کے دل میں کوئی بات ڈال دیں۔ انبیاء کا یہ الہام وحی ہونے کی حیثیت سے ایک شرعی دلیل ہے۔ عام افراد کے لیے بھی اس عمل کو اصطلاحاً وجدان یا الہام ہی کہتے ہیں۔ دینِ اسلام میں غیر نبی کے وجدان یا الہام کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے' اگرچہ صوفیاء کے ایک قلیل طبقے نے اس کو ایک مستند ذریعۂ علم قرار دیا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے اللہ سبحانہ وتعالیٰ یا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات الہام کی ہے تو اس حقیقت کو معلوم کرنا کہ واقعتاً اس شخص کو وہ بات اللہ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے الہام کی گئی ہے' ایک ناممکن امر ہے اور اس کا کوئی معیار (criteria) اس دنیا میں موجود نہیں ہے جس پر اس کو پرکھا جا سکے کہ یہ بات اللہ ہی کی طرف سے الہام ہے یا شیطانی وساوس ہیں۔ لہٰذا کسی بھی بڑے سے بڑے عالم دین یا بزرگ وصوفی کا وجدان اُمتِ مسلمہ کے حق میں کسی شرعی دلیل کے مترادف نہیں ہے۔

دُنیوی علوم کے حصول کا ایک اور ذریعہ 'عقل' بھی ہے۔ علمِ فلسفہ میں اس ذریعۂ علم کو حصولِ علم میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ فلاسفہ' عقلِ محض کی رہنمائی اور تفکّر وتعقّل کی روشنی میں امورِ غیبیہ اور ما بعد الطبیعی (metaphysical) امور کی تشریح کرتے ہیں' اللہ کے وجود اور عدمِ وجود' انسانی مبدأ ومعاد' تخلیق کائنات' ربط الحادث بالقدیم' خیر وشر اور اخلاقی اقدار پر گفتگو کرتے ہیں۔ علمِ کلام اور علمِ منطق میں بھی کافی حد تک عقل کو ذریعۂ علم تسلیم کیا گیا ہے۔ دین میں عقل' احکامِ الٰہی کو حاصل کرنے کا ذریعہ تو نہیں ہے' لیکن ان کو سمجھنے میں اس کی حیثیت مسلّم ہے۔

## دینِ اسلام کے حصول کے ذرائع

ہمارا موضوع اس وقت دین اسلام ہے۔ اس دنیا میں اس وقت دین اسلام کا تنہا ماخذ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ہیں۔ اللہ کا دین قرآن کی صورت میں ہو یا قرآن کے علاوہ، وہ ہمیں محمد ﷺ کی ذات سے ہی ملا ہے۔ جب تک آپ ﷺ کتاب اللہ کو قرآن قرار نہ دیں اُس وقت تک وہ قرآن نہیں بنتا۔ یعنی قرآن بھی آپ ﷺ کے بتانے سے ہی قرآن بنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہ دین اسلام، کتاب وسنت کی صورت میں موجود تھا اور آپ ﷺ اس دین کو اپنے اقوال، افعال اور تقریرات کے ذریعے صحابہ رضی اللہ عنہم تک پہنچا رہے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ سے ہم تک یہ دین کیسے منتقل ہوا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کیا ہمارا دین اس بارے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے کتاب وسنت کی صورت میں جو دین اسلام حاصل کیا ہے، وہ قیامت تک آنے والے آپ ﷺ کے ہر ہر اُمتی تک کن ذرائع سے پہنچے گا؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ:

(۱) اللہ کے رسول ﷺ آج ہمارے مابین موجود نہیں ہیں، لہٰذا ہم آپؐ کے اقوال وافعال کے براہِ راست مشاہدے سے اس دین کا علم حاصل نہیں کر سکتے جو آپؐ پر کتاب وسنت کی صورت میں نازل ہوا ہے یا جسے آپ ﷺ کے اجتہاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی تصویب وتائید حاصل ہوئی ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص محض اپنی عقل سے غور وفکر کرتے ہوئے اس دین کو معلوم کر لے جو آپ ﷺ پر نازل ہوا تھا تو یہ بھی ناممکن ہے۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ دین جو آج سے چودہ سو سال پہلے محمد ﷺ پر نازل ہوا تھا، میں اپنے وجدان سے معلوم کر لوں تو دین اسلام کے حصول کی یہ صورت بھی قابل عمل نہیں ہے، کیونکہ اس کا کوئی معیار نہیں ہے کہ جس کو وہ اپنے دل میں محسوس کر رہا ہے وہ واقعتاً وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ پر نازل ہوا تھا یا شیطانی وساوس ہیں۔

(۴) پس دین کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ہمارے پاس باقی رہ جاتا ہے اور وہ خبر ہے۔ اب یہ خبر متواتر بھی ہو سکتی ہے اور آحاد بھی، قطعی بھی ہو سکتی ہے اور ظنی بھی۔ لہٰذا خبر اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ مجھے اور آپ کو اس خبر کے ذریعے ہی دین اسلام حاصل ہوتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات دین کا بنیادی موضوع ہے کہ یہ دین اسلام اللہ کے رسول ﷺ سے قیامت تک آنے والے ہر ہر امتی تک کیسے پہنچے گا اور دین نے اس کو بیان بھی کیا ہے۔ جس طرح کسی چیز کا دین ہونا یا نہ ہونا ایک اہم بحث ہے، اتنی ہی اہمیت کی حامل یہ بات بھی ہے کہ وہ دین ہم تک کیسے پہنچے گا؟ دین ہو یا دین کے ہر ہر امتی تک پہنچنے کا ذریعہ ہو، دونوں کی اہمیت عقلی ومنطقی اعتبار سے برابر ہے۔

## دین اسلام کے حصول کا بنیادی ذریعہ خبر ہے

ہم یہ بات اوپر واضح کر چکے ہیں کہ جو دین اسلام، اللہ کے رسول ﷺ پر کتاب وسنت کی صورت میں نازل ہوا تھا، آج ہمارے پاس اس دین کے حصول کا بنیادی ذریعہ خبر ہے۔ کتاب اللہ بھی ہمیں خبر سے ملی ہے اور یہ

قراء کی خبر ہے، جبکہ سنتِ رسول ﷺ کی بنیاد بھی خبر ہی ہے اور یہ محدثین کی خبر ہے۔ ہر دور میں مصاحفِ قرآنیہ کی تصحیح قراء کرتے رہے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ مصاحف میں لکھا ہوا بھی اپنی تصحیح میں قراء کی خبر کا محتاج ہے اور کتاب اللہ میں ان قراء کی خبر اصل ہے۔ اسی طرح کتبِ احادیث میں املا و کتابت کی اغلاط پر محدثین عظام متنبہ کرتے رہے ہیں جو حدیث میں محدثین کی خبر کے اصل ہونے کی دلیل ہے۔

دین اسلام نے اپنے نسل در نسل انتقال کے لیے جب خبر کو بنیادی ذریعہ بنایا تو انتقالِ علم کا یہ کوئی نیا ذریعہ نہیں تھا جسے سب سے پہلے دینِ اسلام نے استعمال کیا ہو، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کی اس دنیا میں آمد ہی سے علم کے منتقل ہونے کے ذرائع میں ذریعہ خبر کو ایک بنیادی اور معتبر ذریعہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ پس خبر ہر دور میں دینی و دُنیوی علوم مثلاً کتبِ سماویہ اور تاریخِ انسانی وغیرہ کے منتقل ہونے کا بنیادی ذریعہ رہی ہے۔

## خبر کا تجزیاتی مطالعہ

جب خبر دین اسلام کے حصول کا بنیادی ذریعہ قرار پائی تو اس کا ایک تجزیاتی مطالعہ از بس ضروری ہے۔ خبر کیا ہے یا اس کی اصطلاحی تعریف کیا ہے؟ ہم اس بارے میں علومِ قرآن یا علم النحو یا بلاغت یا اصولِ فقہ کی کتب کھنگال کر اس کی متفرق اصطلاحی تعریفوں اور ان کی ردّ و قدح کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ اس دنیا میں ہر شخص جانتا ہے کہ خبر کیا شے ہے۔ اگر کسی چیز کی وضاحت کی ضرورت ہے تو وہ خبر کی مختلف صورتیں اور ان سے حاصل ہونے والے علم کے درجات ہیں۔

یہ امر واضح ہے کہ خبر میں جھوٹ اور سچ دونوں امکان پائے جاتے ہیں۔ کسی خبر میں سچ اور جھوٹ کے امکانات کی نسبت و تناسب (ratio) کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں:

100 90 80 70 60 50 40 30 20 10 0

یعنی جب ہمیں کوئی خبر ملتی ہے تو اس خبر کے سچا یا جھوٹ ہونے کے بارے میں اطمینانِ قلب و نفس کے پہلو سے ہم صفر سے ۱۰۰ تک کے درجات میں سے کسی ایک درجہ میں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی خبر کے بارے میں ہم تقریباً ۱۰۰ فی صد مطمئن ہوں کہ وہ سچی یا جھوٹی ہے تو اس آخری درجہ کے اطمینانِ نفس کو اہلِ منطق کی اصطلاح میں علم یقینی یا علم قطعی یا علم کہتے ہیں، اور اگر یہ اطمینانِ قلب صفر درجہ سے زائد اور ۵۰ سے کم ہو تو اسے 'وہم' کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر ۵۰ سے اوپر اور ۱۰۰ سے نیچے ہو تو اسے 'ظن غالب' یا صرف 'ظن' بھی کہہ دیتے ہیں۔ اگر اطمینانِ قلب تقریباً ۵۰ درجہ پر ہو یعنی دونوں طرف برابر کا احتمال ہو تو اسے 'شک' کہتے ہیں۔

قرآن مجید ایک ایسی قطعی خبر ہے کہ جس کے سچ ہونے کا اطمینان ۱۰۰ فی صد ہے اور اس میں جھوٹ ہونے کا پہلو صفر درجہ میں ہے۔ اسی طرح اگر کسی روایت کے موضوع ہونے پر محدثین کا اتفاق ہو تو اس روایت کی اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نسبت میں سچ ہونے کا پہلو صفر درجہ میں ہوتا ہے اور جھوٹ ہونے کا امکان ۱۰۰ درجہ میں ثابت ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں ہم درج ذیل نتائج نکال رہے ہیں:

(۱) بعض اوقات ایک خبر میں اس کے جھوٹ یا سچ کے امکانات میں سے ایک امکان قطعی طور پر ثابت ہو جاتا

ہے تو اسے خبر قطعی کہتے ہیں، یعنی خبر میں سے ایک پہلو قطع ہو گیا یا ختم ہو گیا اور دوسرا یقینی طور پر متعین ہو گیا۔ ایسی خبر کہ جس میں ایک پہلو ختم ہو گیا ہو، علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ خبر متواتر سے علمِ قطعی حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح محدثین کے ہاں موضوع روایت سے بھی علمِ قطعی حاصل ہوتا ہے، یعنی اس خبر میں اللہ کے رسول ﷺ کی طرف جھوٹ کا پہلو قطعیت کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض اوقات ایک خبر میں سچ یا جھوٹ کا پہلو غالب ہوتا ہے، یعنی ۵۰ درجہ سے اوپر ہوتا ہے، تو ایسی خبر سے 'ظن' حاصل ہوتا ہے۔ محدثین کے ہاں 'ظن' سے مراد محض ظن نہیں ہوتا بلکہ 'ظن غالب' ہوتا ہے جس کا سادہ سا معنی و مفہوم ہم یہ بیان کر سکتے ہیں کہ کسی روایت میں سچ یا جھوٹ کے پہلو کا ظن ۷۵ سے اوپر درجہ کا ہے، اور ایسی خبر دین میں علم و عمل کے لحاظ سے مفید ہے۔

(۳) بعض اوقات ایک خبر میں سچ یا جھوٹ کا پہلو مغلوب ہوتا ہے، یعنی ۵۰ فی صد سے کم درجہ میں ہوتا ہے، تو ایسی خبر سے 'وہم' حاصل ہوتا ہے، اور محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت جس کی اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نسبت کی سچائی ۵۰ درجہ سے کم ہو تو 'ضعیف' کہلاتی ہے۔

(۴) بعض اوقات ایک خبر میں سچ یا جھوٹ کا پہلو غالب ہوتا ہے، یعنی ۵۰ فی صد سے کافی زائد ہوتا ہے اور اس خبر سے 'ظن غالب' حاصل ہو رہا ہوتا ہے، لیکن اس خبر کے حق میں کچھ مزید قرائن مل جانے کی وجہ سے وہ خبر 'ظن غالب' سے 'علم' کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے۔ اسے محدثین کے ہاں **'خبر الواحد المحتف بالقرائن'** کا نام دیا جاتا ہے، مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم کی اخبار آحاد سے قرائن کی وجہ سے 'علم یقینی' حاصل ہوتا ہے۔

(۵) بعض اوقات ایک خبر میں سچ یا جھوٹ کا پہلو مغلوب ہوتا ہے، یعنی ۵۰ فی صد سے کم ہوتا ہے اور اس سے 'وہم' حاصل ہو رہا ہوتا ہے، لیکن قرائن و شواہد کے مل جانے کی وجہ سے اس خبر کا 'وہم' بڑھ کر 'ظن' کے درجہ میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور اگر کسی خبر کی اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نسبت میں سچائی کا پہلو قرائن کی وجہ سے 'وہم' سے 'ظن' کے درجہ میں منتقل ہو جائے تو اسے محدثین کی اصطلاح میں بعض اوقات 'حسن' اور بعض اوقات 'صالح' اور بعض اوقات 'حسن لغیرہ' وغیرہ کہہ دیتے ہیں۔

اس دنیا میں بسنے والے انسان اپنی روزمرہ زندگی میں مختلف اخبار میں 'وہم' سے 'ظن' اور 'ظن' سے 'ظن غالب' اور 'ظن غالب' سے 'علم' تک کا سفر اس کثرت سے کرتے ہیں کہ یہ ایک بدیہی امر بن چکا ہے، جس کا انکار کسی انسان کے لیے ناممکن ہے۔ اس بات کو ایک سادہ سی مثال سے یوں سمجھیں کہ زید ۱۵ سال کا ایک نوجوان لڑکا ہے اور اس کے بچپن کے دو دوست حامد اور احمد ہیں۔ حامد کی سال میں ایک آدھ دفعہ زید سے ملاقات ہو جاتی ہے، جبکہ احمد اس سے مستقل طور پر رابطے میں ہے۔ اچانک ایک دن معلوم ہوا کہ زید کو کینسر ہے اور اس کو ہسپتال میں داخل کروا دیا جاتا ہے۔ حامد کو زید کی اس بیماری کا علم نہیں ہے جبکہ احمد، زید کی عیادت کے لیے ہسپتال جاتا رہتا ہے۔ اچانک ایک دن حامد اور احمد دونوں کو کسی تیسرے شخص کی طرف سے صرف اتنی خبر ملتی ہے کہ زید کی وفات ہو گئی ہے تو حامد کو ملنے والی خبر، صرف خبر واحد ہے جبکہ احمد کو ملنے والی خبر **'خبر الواحد المحتف بالقرائن'** ہے، لہٰذا اس خبر کو سننے کے بعد دونوں کو حاصل ہونے والا علم مختلف ہو گا۔

اس دنیا میں رہتے ہوئے بہت سی خبروں کے بارے ہم 'وہم' میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثر خبریں ایسی ہوتی ہیں جو ساری زندگی 'وہم' ہی رہتی ہیں' لیکن اس سے کسی انسان کو انکار ممکن نہیں ہے کہ بعض 'وہم' قرائن کی وجہ سے 'ظن' اور بعض اوقات 'ظن' سے بھی بڑھ کر 'علم' کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً جب نائن الیون کا واقعہ ہوا تو یہ خبر 'وہم' کے درجہ میں موجود تھی کہ امریکہ نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر خود حملے کروائے ہیں' جبکہ آج قرائن کی کثرت نے انسانی دنیا کی اکثریت کے اس 'وہم' کو 'ظن غالب' اور بعض خواص و ماہرین کے وہم کو 'علم' کے درجہ تک پہنچا دیا ہے کہ ان حملوں میں خود امریکی حکومت اور سی آئی اے بھی ملوث تھی۔ اس خبر میں 'وہم' کو 'ظن' یا 'علم' کے درجہ تک پہنچانے والے وہ قرائن یعنی ویڈیوز' انٹرویوز' تبصرے' ٹاک شوز' سائنسی حقائق' کتب' رسائل و جرائد اور صحافیوں کے سوالات ہیں' جنہیں مغربی اور مشرقی میڈیا میں پچھلے دس سال کے دوران بڑے پیمانے پر عام کیا گیا ہے۔ اسی طرح حال ہی میں امریکہ کی طرف سے شیخ اسامہ بن لادن کی ہلاکت کا دعویٰ بعض کے لیے 'وہم' اور بعض کے لیے 'ظن' کا درجہ رکھتا تھا' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ قرائن اور حالات و واقعات کی روشنی میں ماضی کی اس خبر کا 'وہم' اور 'ظن' علم کے درجہ میں منتقل ہو گیا ہے کہ امریکہ اپنے اس دعویٰ میں صادق ہے یا کاذب۔

## محدّثین کے نزدیک خبر کی صحت وضعف کا تجزیہ

محدثین نے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نسبت کردہ روایت کی تحقیق دو اعتبارات سے کی ہے:

**(۱) سند کے اعتبار سے**

**(۲) متن کے اعتبار سے**

محدثین عظام پہلے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نسبت کردہ روایت کی سند کی تحقیق کرتے ہیں اور پھر متن کی تحقیق کرتے ہیں۔ سند کی تحقیق سے مراد ان کے ہاں دو چیزیں ہیں:

**(۱) رواۃ کی تحقیق' یعنی روایت کے جمیع راویوں کی عدالت اور ضبط کی تحقیق**

**(۲) اتصالِ سند کی تحقیق' یعنی سند میں موجود ظاہری اور خفی انقطاع کی تحقیق**

محدثین نے اصولِ حدیث میں شریعت کے نقل کرنے کی ایک اہلیت مقرر کی ہے اور وہ کسی شخص کا عادل اور ضابط ہونا ہے۔ یعنی جس شخص میں یہ بنیادی معیار موجود ہو گا وہ شریعت کو نقل کرنے کا اہل ہو گا۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء نے بھی اصولِ فقہ میں شریعت پر عمل کے لیے اہلیت وجوب اور اہلیت ادا کی ابحاث کی ہیں۔ پس شریعتِ اسلامیہ کے نقل کی بحث ہو یا اس پر عمل کی' دونوں کے لیے الگ الگ معیارات اصول کی کتابوں میں موجود ہیں۔ شریعت کے نقل میں محدثین نے راوی کی عدالت اور ضبط کو بہت اہمیت دی ہے' کیونکہ کسی خبر میں جھوٹ وخطا کا امکان یا تو تزکیہ نفس اور تقویٰ و تدین کی کمی سے ہو سکتا ہے یا پھر حافظہ و کتابت کے ناقص ہونے سے۔

کسی شخص کے عادل ہونے سے مراد یہ ہے کہ دینی خبر کا راوی کذب' تہمت کذب' فسق و فجور' بدعت اور جہالت (ذات یا حالات کے مجہول ہونے) کے طعن سے پاک ہو' اور کسی شخص کے ضابط ہونے سے مراد یہ ہے

کہ وہ فحش الغلط، کثرتِ غفلت، وہم، مخالفتِ ثقات اور سوئے حفظ کے طعن سے پاک ہو۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ عدالت میں طعن اختیاری اور کسبی ہے، یعنی ایک راوی کا عادل ہونے یا نہ ہونے میں مکمل اختیار ہوتا ہے، جبکہ ضبط میں طعن اختیاری نہیں ہے، یعنی ایک راوی ضابط ہے یا نہیں؟ اس میں اس کا اپنا اختیار نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے۔ پس پہلی قسم کا طعن یعنی عدالت کا طعن دوسری قسم کے طعن یعنی ضبط کے طعن سے بہت بڑھ کر ہے۔ پس ایک غیر عادل ضابط راوی، ایک عادل غیر ضابط راوی سے درجہ میں برابر نہیں ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ کسی راوی میں کذب کی وجہ سے عدالت کا جس درجے کا طعن ثابت ہوتا ہے، وہ عام فسق وفجور یا راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والے طعن کے برابر نہیں ہوتا۔ اسی طرح کسی راوی کے فحش غلطیاں کرنے کی وجہ سے اس کے ضبط میں جو طعن پیدا ہوتا ہے وہ اس کے وہم کی وجہ سے ضبط میں پیدا ہونے والے طعن کے برابر نہیں ہوتا۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ عدالت میں طعن کے پانچ اسباب ہوں یا ضبط میں طعن کے پانچ اسباب، ان دس اسباب سے پیدا ہونے والا ضعف ایک جیسا نہیں ہوتا۔ بعض اسبابِ طعن سے خبر میں شدید ضعف پیدا ہوتا ہے کہ جس کو دور کرنے کے لیے قوی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ بعض اسبابِ طعن سے خبر میں خفیف ضعف پیدا ہوتا ہے کہ جس کا ضعف عمومی قرائن سے بھی دور ہو جاتا ہے۔

اگر کسی دینی خبر کے جمیع راوی عادل اور ضابط ہوں تو اس کے بعد ان رواۃ کے باہمی اتصال کو دیکھتے ہیں کہ سند (chain of narrators) میں کوئی انقطاع (discontinuance) تو موجود نہیں ہے۔ یعنی محدث سے اللہ کے رسول ﷺ تک کی سند میں درمیان میں کوئی ایک یا زائد راوی گرا تو نہیں ہوا ہے؟ جس طرح عدالت اور ضبط میں طعن کی وجہ سے خبر کا ضعف ایک جیسا نہیں ہوتا اسی طرح انقطاعِ سند کی مختلف صورتوں کی وجہ سے خبر میں پیدا ہونے والا ضعف بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مثلاً انقطاعِ سند کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی سند میں دو یا زائد راوی پے در پے گرے ہوں، جسے محدثین کے ہاں 'عضل' کہتے ہیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک جلیل القدر تابعی، صحابی کا نام لیے بغیر براہِ راست اللہ کے رسول ﷺ سے کوئی روایت نقل کر دے، جسے محدثین کی اصطلاح میں 'ارسال' کہتے ہیں۔ انقطاع کی یہ دونوں قسمیں عقل ومنطق کی نظر میں برابر نہیں ہیں، لہٰذا ان دونوں صورتوں میں خبر میں پیدا ہونے والا ضعف بھی برابر نہیں ہے۔

ان تین اعتبارات یعنی عدالت، ضبط اور اتصال سے سند کی تحقیق کے بعد متن کی تحقیق کے لیے محدثین عظام متن میں شذوذ اور علل پر نظر دوڑاتے ہیں، اور اگر کسی روایت کا متن شاذ ہو یا اس کے متن میں کوئی خفیہ علت ہو تو اس کی سند صحیح ہونے کے باوجود اس روایت کو بحیثیت مجموعی ضعیف قرار دیتے ہیں۔ پس کسی دینی خبر کی روایت کی صحت کا دارومدار صرف سند یا صرف متن نہیں ہے۔ ہم آسانی کی خاطر دینی خبر کی چار صورتیں بنا سکتے ہیں:

(۱) **سنداً صحیح متناً صحیح**: یعنی جس روایت کی سند اور متن دونوں صحیح ہوں۔

(۲) **سنداً صحیح متناً ضعیف**: یعنی جن روایات کی سند صحیح ہو، لیکن متن میں شذوذ یا خفیہ علت کی وجہ سے ضعف ہو۔ اس کی مثال حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما والی روایت ہے کہ جس کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت

میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا۔ اس قسم کے علم کو محدثین کے ہاں 'علل الحدیث' کا نام دیا جاتا ہے۔

(۳) **سنداً ضعیف متناً ضعیف**: یعنی جس کی سند اور متن دونوں ضعیف ہوں۔

(۴) **سنداً ضعیف متناً صحیح**: یعنی جس کی سند ضعیف ہو' لیکن اس کا متن صحیح ہو' اور یہی روایات ہمارے اس مضمون کا موضوع ہیں۔ یعنی وہ روایات جو اپنا اسنادی ضعف خارجی قرائن کی بدولت کم کر کے 'وہم' سے 'ظن' کے درجہ میں پہنچ جاتی ہوں۔

## محدثین کے نزدیک ضعیف روایت کا مقام

ضعیف روایت کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ بھی عام ہے کہ اس کا درجہ وہی ہے جو موضوع روایت کا ہے' حالانکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ ایک موضوع روایت تو اپنی نسبت الی الرسول ﷺ کے ثبوت میں zero level پر ہوتی ہے' لیکن ضعیف روایت کو ثبوت کے اعتبار سے zero کے برابر رکھنا عقل و نقل کے خلاف ہے۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ ضعیف روایات میں ضعف کے خفیف اور شدید ہونے کے اعتبار سے نسبت الی الرسول ﷺ کے ثبوت کا پہلو مغلوب ہوتا ہے' اگرچہ اس کے درجات ۵۰ سے نیچے کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم کی ایک بڑی جماعت نے ضعیف روایت کو موضوع کی طرح کالعدم نہیں سمجھا ہے' بلکہ اس سے بھی اس کی حیثیت و ثبوت کے مطابق کہیں نہ کہیں استفادہ کیا ہے' چاہے اس استفادے کی نوعیت کسی کپڑے میں پیوند لگانے کے درجہ ہی کی کیوں نہ ہو۔

امام احمد بن حنبل اور امام ابوداؤد رحمہما اللہ کے نزدیک اگر حدیث کا ضعف خفیف ہو تو ایسی ضعیف روایات کو 'قیاس' پر ترجیح دیتے ہوئے قابلِ احتجاج سمجھا جائے گا۔ (منهج النقد فی علوم الحديث : ص ۲۹۱' دار الفكر' دِمشق) امام عبداللہ بن مبارک' عبدالرحمٰن بن مہدی' سفیان بن عیینہ' سفیان ثوری' امام نووی' امام ابن کثیر اور امام سیوطی وغیرہ رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے کہ وہ فضائل و زہد کے باب میں ضعیف رواۃ کی روایات قبول کر لیتے تھے۔ (الحديث الضعيف وحكم الاحتجاج به للدكتور عبد الكريم بن عبد الله الخضير : ص۲۷۸۔۲۷۹' دار المسلم' الرياض) بعض اہل علم کا کہنا یہ ہے کہ ان مذکورہ بالا ائمہ کے نزدیک ضعیف روایت کی کتابت اور روایت جائز ہے نہ کہ اس پر عمل۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک ان مذکورہ بالا ائمہ کے ضعیف روایات کے بارے میں مروی اقوال کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ ان کے نزدیک رقائق کے باب میں یعنی دلوں کو نرم کرنے والی باتوں کے بیان میں ضعیف روایت قابل احتجاج ہے نہ کہ فضائل اعمال میں۔

جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک ضعیف روایت پر فضائل اعمال میں عمل کیا جا سکتا ہے' بلکہ امام نووی' ملا علی القاری اور ابن حجر ہیثمی رحمہم اللہ نے اس بات پر اتفاق نقل کیا ہے کہ ضعیف روایات پر فضائل اعمال میں عمل جائز ہے۔ (منهج النقد فی علوم الحديث: ص۲۹۲۔۲۹۳)

امام ابن حجر رحمہ اللہ نے ضعیف روایت پر عمل کی کچھ شرائط مقرر کی ہیں' اور ان شرائط کا بیان بہت ہی خوبصورت اور عمدہ ہے' جو درج ذیل ہیں:

(۱) راویت کا ضعف قوی نہ ہو یعنی کسی راوی پر کذب یا تہمت کذب یا فحش الغلط کا طعن نہ ہو۔

(۲) وہ خفیف الضعف روایت شریعت اسلامیہ میں ثابت شدہ کسی اصلِ عام کے تحت داخل ہو۔

(۳) اس خفیف الضعف روایت پر عمل کرتے وقت نسبت الی الرسول ﷺ کا عقیدہ نہ ہو۔ (ایضاً)

اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ متقدمین سلف صالحین کے نزدیک اگرچہ ترغیب وترہیب سے متعلق ضعیف روایات کا بیان اور ان پر عمل جائز ہے' لیکن ضعیف روایت سے کوئی شرعی حکم وجوب یا استحباب ثابت نہیں ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی اپنی رائے بھی یہی ہے۔ (مجموع الفتاویٰ: ۱۸/۶۵۔۶۸)

امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ)' امام مالک (م ۱۷۹ھ)' سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ)' امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ) اور امام ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) رحمہم اللہ وغیرہ مرسل روایت سے حجت پکڑتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ (م ۲۰۴ھ) نے بھی چند شرائط کے ساتھ مرسل روایات کو قبول کیا ہے' جبکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (م ۲۴۱ھ) 'مسند' کی غیر موجودگی میں 'مرسل' سے حجت پکڑنے کے قائل ہیں اور یہی موقف امام ابوداؤد رحمہ اللہ (م ۲۷۵ھ) کا بھی ہے۔ ائمہ جرح وتعدیل میں سے یحییٰ بن سعید القطان (م ۱۹۸ھ) اور علی بن مدینی (م ۲۳۴ھ) رحمہما اللہ وغیرہ کا موقف یہ ہے کہ اگر ارسال کرنے والے کی عادت ہو کہ ثقہ راوی سے ارسال کرتا ہے تو اس کی مرسل قابل قبول ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ (م ۴۵۶ھ) کے بقول اگر مرسل روایت پر اجماع ہو جائے تو وہ قابل قبول ہے اور اس کی سند کی احتیاج ختم ہو جائے گی' وغیر ذلک۔ (مباحث فی تحریر اصطلاح الحدیث المرسل وحجیته عند السادة المحدثین للشیخ حاتم بن عارف العونی : ص ۱۷۔۳۶' جدة)

بعض اہلِ علم مثلاً ابن حزم' ابن العربی' شہاب خفاجی' جلال دوانی' یحییٰ بن معین' ابوزرعہ رازی' ابوحاتم رازی' ابن ابی حاتم رازی اور امام شوکانی وغیرہ رحمہم اللہ کے نزدیک ضعیف روایت کسی بھی اعتبار سے قابلِ احتجاج نہیں ہے۔ بعض معاصر اہل علم اور فن حدیث کے محققین مثلاً شیخ احمد شاکر اور علامہ البانی رحمہما اللہ وغیرہ نے بھی اس موقف کو اختیار کیا ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کی طرف بھی اس موقف کی نسبت کی جاتی ہے۔ (الحدیث الضعیف وحکم الاحتجاج به : ص ۲۶۱۔۲۷۲) لیکن ترغیب وتشویق کی روایات پر مبنی امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب **'الأدب المفرد'** سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین فی الحدیث رحمہ اللہ کی طرف اس موقف کی نسبت درست نہیں ہے کیونکہ اس میں ضعیف روایات بھی موجود ہیں۔

یہاں اس بحث کے کرنے سے مقصود یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ احکام یا فضائلِ اعمال میں ضعیف روایت پر عمل جائز ہے' کیونکہ یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے اور ضعیف روایت پر عمل کی بحث کی تفصیل میں ایک متوازن موقف کو ہم کسی اور وقت کے لیے چھوڑے دیتے ہیں۔ اہل علم کے اس اختلاف کو نقل کرنے سے اس وقت مقصود صرف یہی ہے کہ جمہور اہلِ علم اور محدثین کے نزدیک ضعیف روایت کا درجہ zero نہیں ہے' لہٰذا وہ اسے اس کے کچھ نہ کچھ درجہ کی وجہ سے کسی نہ کسی جگہ کسی نہ کسی مقصد مثلاً کتابت' روایت' متابعت' بطور شاہد' بطور احتجاج' فضائل میں عمل کے لیے' قیاس پر ضعیف روایت کو ترجیح دینا یا رقائق میں وعظ ونصیحت یا تفسیر میں یا مغازی وسیرت کے بیان یا مسند کی عدم موجودگی وغیرہ میں استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ مقصود کلام یہ ہے کہ موضوع اور

ضعیف روایت کا درجہ ایک نہیں ہے۔ موضوع روایت کی نسبت الی الرسول ﷺ کے بارے میں تو یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ zero درجہ پر ہوتی ہے' لیکن ضعیف کے بارے میں ایسا کہنا درست نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل علم یا محدثین نے ضعیف روایات کے ساتھ کسی بھی دور میں ایسا سلوک نہیں کیا ہے کہ انہیں موضوع سمجھ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا ہو' بلکہ کہیں نہ کہیں ان سے کسی نہ کسی صورت میں کسی نہ کسی درجہ میں استفادہ کیا ہے' اگرچہ اس استفادہ کی صورتوں اور حدود و قیود کی تفصیل میں بحث ممکن ہے اور ہونی بھی چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ موضوع روایت کے بارے میں تو قرآن کا طرزِ عمل یہ ہے کہ اسے سنتے ہی رد کر دینے کا حکم دیا ہے یا دوسرے الفاظ میں ایسی روایت کو پھینک دینے کا کہا ہے' جیسا کہ واقعہ افک کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (النور)

''کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اس خبر کو سنا تو مؤمن مردوں اور عورتوں نے اپنوں کے بارے میں اچھا گمان کیا اور انہوں نے کہا: یہ تو صریح جھوٹ ہے!''

آگے چل کر ارشاد ہے:

﴿وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴾ (النور)

''اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اس خبر کو سنا تو تم نے کہا ہوتا ہمارے لیے تو یہ درست نہیں ہے کہ ہم ایسی بات کریں' ہم اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور یہ تو بہتانِ عظیم ہے۔''

جبکہ ضعیف روایت کے بارے میں کلامِ الٰہی کا رویہ ایسا نہیں ہے کہ اسے سنتے ہی رد کر دو یا پھینک دو' جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ﴾ (الحجرات : ٦)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو (اس خبر کی)۔''

## کذوب یا کذاب کی خبر کا دین میں مقام

ایک کذوب یا کذاب کی خبر کے بارے میں عقل عام کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اسے رد کرتی ہے۔ اسی طرح دین میں بھی کذوب یا کذاب کی خبر کے بارے میں اصل اصول یہی ہے کہ وہ نا قابلِ قبول اور مردود ہے' لیکن چونکہ ایک کذوب بلکہ کذاب سے بھی یہ عقلی و منطقی امکان ہوتا ہے کہ وہ کسی خبر میں صادق ہو' لہٰذا قوی قرائن کی بدولت کذوب یا کذاب کی خبر بھی بعض مخصوص حالات میں قابل قبول ہوتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ مخبر جس قدر زیادہ کذب میں مبتلا ہوگا' اس کی خبر کے درجہ قبولیت تک پہنچنے کے لیے اسی قدر قوی قرائن مطلوب ہوں گے۔ مثلاً شیطان کذاب ہے اور اس کی خبر مردود ہے' لیکن جب اس کی خبر کو اللہ کے رسول ﷺ کی تصدیق کا قرینہ مل گیا تو اس کی خبر مقبول ہوگئی' جیسا کہ صحیح بخاری میں شیطان کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو آیت الکرسی بتلانے کا واقعہ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ﷺ قَالَ وَكَّلَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِحِفْظِ زَكَاةِ رَمَضَانَ فَاَتَانِیْ آتٍ فَجَعَلَ یَحْثُوْ مِنَ الطَّعَامِ فَاَخَذْتُهُ فَقُلْتُ لَاَرْفَعَنَّكَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَصَّ الْحَدِیْثَ فَقَالَ اِذَا اَوَیْتَ اِلٰی فِرَاشِكَ فَاقْرَاْ آیَةَ الْكُرْسِیِّ لَنْ یَزَالَ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ حَافِظٌ وَلَا یَقْرَبُكَ شَیْطَانٌ حَتّٰی تُصْبِحَ وَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوْبٌ ذَاكَ شَیْطَانٌ. (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورة البقرة)

''حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے ماہِ رمضان کی زکوٰۃ کی حفاظت پر مامور کیا۔ پس میرے پاس ایک آنے والا آیا اور (زکوٰۃ کے) کھانے میں سے کچھ اٹھانے لگا تو میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ میں تمہیں لازماً اللہ کے رسول ﷺ تک لے کر جاؤں گا۔ پس اس کے بعد انہوں نے مکمل قصہ نقل کیا (اور اس کے آخر میں) شیطان نے (حضرت ابو ہریرہ ؓ سے) کہا: جب آپ اپنے بستر پر جائیں تو آیت الکرسی پڑھ لیا کریں، اس طرح اللہ کی طرف سے آپ کے ساتھ ایک نگران ہمیشہ رہے گا اور شیطان آپ کے قریب بھی نہ آ سکے گا یہاں تک کہ صبح ہو جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے (حضرت ابو ہریرہ ؓ سے) فرمایا: اس نے تجھ سے سچ کہا حالانکہ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے اور (اے ابو ہریرہ!) وہ شیطان تھا۔''

ایک کذاب کی خبر کو اللہ کے رسول ﷺ کی تصدیق نے مقبول درجہ تک پہنچا دیا حالانکہ وہ خبر عام اصول کے مطابق عادتاً مردود تھی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ تصدیقِ رسول ﷺ کوئی کم درجہ کا قرینہ نہیں ہے جو راہ چلتے حاصل ہو جائے، بلکہ یہ بہت ہی قوی، نادر اور مفقود قرینہ ہے۔ اب ہمارے پاس کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے کہ جس سے حدیث میں کسی کذاب کی روایت مقبولیت کے درجہ کو پہنچ جائے، لہٰذا کذاب یا کذوب کی روایت ہر صورت مردود ہے۔

## فاسق یا مُتّهم بالکذب کی خبر کا دین میں حکم

جہاں تک فاسق یا متہم بالکذب کا معاملہ ہے تو اس کی خبر کے بارے میں بھی اصل اصول یہی ہے کہ وہ قابل اطمینان نہیں ہے، لیکن اگر اس کی خبر کو کچھ قوی قرائن مل جائیں تو وہ بعض اوقات قبولیت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا ﴾ (الحجرات: ٦)

''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو (اس خبر کی)۔''

اس آیت مبارکہ میں دین و دنیا سے متعلق کسی بھی خبر واحد کو قبول کرنے کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس خبر کی تحقیق کر لیا کرو۔ یعنی فاسق کی خبر کو رد کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ تحقیق کے بعد قبول و رد کا اختیار دیا گیا ہے۔ علامہ ابن عاشور (م ۱۳۹۳ھ) رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وتنكير الفاسق ونبإ في سياق الشرط يفيد العموم في الفساق بأي فسق اتصفوا، وفي الأنباء

كيف كانت. (التحرير والتنوير : الحجرات : ٦)

''نفی کے سیاق میں لفظ 'فاسق' اور 'نبا' کو نکرہ لانے سے عموم کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے اور اس سے مراد ہر قسم کے فاسق ہیں' چاہے وہ کسی قسم کے بھی فسق و فجور میں مبتلا ہوں اور اس سے مراد ہر قسم کی خبریں ہیں۔''

امام ابن قیم (م ۷۵۱ھ) رحمہ اللہ آیت مبارکہ ﴿إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ﴾ (الحجرات : ٦) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وههنا فائدة لطيفة وهي أنه سبحانه لم يأمر بردّ خبر الفاسق وتكذيبه وردّ شهادته جملة' وإنما أمر بالتبيّن' فإن قامت قرائن وأدلة من خارج تدل على صدقه عمل بدليل الصدق ولو أخبر به من أخبر' فهكذا ينبغي الاعتماد في رواية الفاسق وشهادته' وكثير من الفاسقين يصدقون أخبارهم ورواياتهم وشهاداتهم بل كثير منهم يتحرى الصدق غاية التحري وفسقه من جهات أخر فمثل هذا لا يردّ خبره ولا شهادته' ولو ردّت شهادة مثل هذا وروايته لتعطلت أكثر الحقوق وبطل كثير من الأخبار الصحيحة ولا سيما من فسقه من جهة الاعتقاد والرأي وهو متحر للصدق فهذا لا يرد خبره ولا شهادته. (التفسير القيم : ١٢٨/٢-١٢٩)

''یہاں ایک نہایت ہی لطیف نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فاسق کی خبر کو رد کرنے یا اس کی تکذیب کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی اس کی شہادت کو من جملہ رد کرنے کا حکم جاری کیا ہے' بلکہ چھان پھٹک کا حکم دیا ہے۔ پس اگر فاسق کے صدق پر خارجی قرائن اور دلائل قائم ہو جائیں تو صدق کی دلیل پر عمل ہوگا' اگرچہ اس کی خبر دینے والا کوئی بھی ہو۔ پس اس طرح فاسق کی خبر اور گواہی پر اعتماد جائز ہوگا۔ پس (قرائن اور دلائل کی روشنی میں) اکثر فساق کی اخبار' روایات اور گواہیوں کی تصدیق کی جائے گی' کیونکہ ان فساق کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جو سچائی کو انتہائی درجہ میں تلاش کرتی ہے اور ان کا فسق و فجور (جھوٹ کے علاوہ) بعض دوسری قسم کا ہوتا ہے [یعنی عموماً فساق و فجار دنیا کا ہر گناہ کر لیں گے لیکن جھوٹ سے بچیں گے' کیونکہ اس سے ان کے دھندے کا اعتماد خراب ہوتا ہے]۔''

یہ تو کذب یا جھوٹ کے علاوہ فسق و فجور کے حامل فساق و فجار کی روایات کا معاملہ ہے۔ اب کذب یا جھوٹ بھی درحقیقت تو فسق و فجور ہی کی ایک قسم ہے۔ پس اگر تو انسان کی زندگی میں غالب طور پر جھوٹ نہ ہو تو ایسے شخص کو فساق و فجار میں شمار کریں گے' اور اگر جھوٹ کسی شخص کی زندگی میں غالب طور پر موجود ہو تو اسے کذوب اور کذاب کے درجہ میں رکھیں گے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأما فسقه من جهة الكذب فإن كثر منه وتكرر بحيث يغلب كذبه على صدقه فهذا لا يقبل خبره ولا شهادته' وإن ندر منه مرة ومرتين ففي رد شهادته وخبره بذلك قولان للعلماء وهما روايتان عن الإمام أحمد رحمه الله' والمقصود ذكر الفسق الذي لا يخرج إلى الكفر. (التفسير القيم : ١٢٩/٢)

''اور جہاں تک ایسے فسق کا معاملہ ہے جو جھوٹ کی وجہ سے ہو' پس اگر تو اس سے اس قدر کثرت سے جھوٹ صادر ہو کہ اس کی سچائی پر غالب آ جائے تو اس کی خبر اور شہادت قبول نہیں کی جائے گی [کیونکہ وہ

فاسق سے کذوب یا کذاب کے درجہ میں داخل ہوگیا ہے ] اور اگر اس سے جھوٹ شاذ و نادر صادر ہو تو اس کی خبر اور شہادت کے قبول ورد میں علماء کے دو اقوال ہیں [ یعنی اس کی خبر و شہادت قابل قبول ہے یا قابل قبول نہیں ہے ] اور یہ دونوں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔ یہاں ہمارا مقصود ایسا فسق و فجور ہے جو کفر تک نہ پہنچاتا ہو۔''

امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) رحمہ اللہ آیت مبارکہ ﴿إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وفيه أيضا أنه متى اقترن بخبر الفاسق دليل آخر يدل على صدقه فقد استبان الأمر وزال الأمر بالتثبت' فتجوز إصابة القوم وعقوبتهم بخبر الفاسق مع قرينة. (مجموع الفتاوىٰ : ۳۰۷/۱۵)

''اس آیت مبارکہ سے یہ مسئلہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ جب فاسق کی خبر کے ساتھ کوئی اور ایسی دلیل مل جائے جو فاسق کے سچا ہونے پر دلالت کر رہی ہو تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے اور پختگی سے شبہ زائل ہو جاتا ہے۔ پس اس صورت میں اگر فاسق کی خبر کے ساتھ کوئی قرینہ مل جائے تو (ایسے فاسق کی خبر کی بنیاد پر کسی) قوم پر چڑھائی کرنا یا اس کو سزا دینا جائز ہو جاتا ہے۔''

شیخ صالح العثیمین آیت مبارکہ ﴿إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والمعنى : خبر الفاسق إذا جاء كم انظروا فى القرائن' فإذا دلت القرائن على قبول خبره اقبلوه' وإذا دلت القرائن على ردّ خبر ردّوا. (شرح مقدمه اصول التفسير للعثيمين : ص ۱۵۷)

''آیت کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ جب تمہارے پاس فاسق کی خبر آئے تو قرائن میں غور کرو؛ پس جب قرائن اس کی خبر کی قبولیت پر دلالت کر رہے ہوں تو اس کی خبر کو قبول کر لو اور جب قرائن اس کی خبر کے رد پر دلالت کر رہے ہوں تو اس کی خبر کو رد کر دو۔''

قرآن کریم میں ایک اور جگہ غیر مسلم کی شہادت بھی قبول کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ شَهَٰدَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ حِينَ ٱلْوَصِيَّةِ ٱثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ ءَاخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى ٱلْأَرْضِ فَأَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةُ ٱلْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِنۢ بَعْدِ ٱلصَّلَوٰةِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ إِنِ ٱرْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِى بِهِۦ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَٰدَةَ ٱللَّهِ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلْءَاثِمِينَ ۝ فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰٓ أَنَّهُمَا ٱسْتَحَقَّآ إِثْمًا فَءَاخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ ٱلَّذِينَ ٱسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ ٱلْأَوْلَيَٰنِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ لَشَهَٰدَتُنَآ أَحَقُّ مِن شَهَٰدَتِهِمَا وَمَا ٱعْتَدَيْنَآ ۖ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰٓ أَن يَأْتُوا۟ بِٱلشَّهَٰدَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَآ أَوْ يَخَافُوٓا۟ أَن تُرَدَّ أَيْمَٰنٌۢ بَعْدَ أَيْمَٰنِهِمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْمَعُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْفَٰسِقِينَ ۝ (المائدة)

''اے اہلِ ایمان! جب تم میں سے کسی ایک کو وصیت کرتے وقت موت آئے تو (اس وقت) تمہاری باہمی شہادت تم میں سے دو عادل افراد ہیں یا تمہارے علاوہ (یعنی غیر مسلموں میں سے) دو افراد ہیں جبکہ تم سفر میں ہو اور تمہیں موت آ پہنچے۔ تم ان دونوں (غیر مسلم گواہوں) کو نماز کے بعد (مسجد میں) روک کر

رکھو گے' پس اگر تمہیں شک ہو (کہ ان دونوں نے شہادت میں ڈنڈی ماری ہے تو) وہ دونوں اللہ کی قسمیں اٹھائیں کہ ہم اس گواہی کے عمل کے بدلہ میں کوئی قیمت حاصل نہیں کریں اور اگرچہ جس کے خلاف گواہی جارہی ہو وہ ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو' اور ہم اللہ کی گواہی کو نہ چھپائیں گے' بے شک ہم (اگر ایسا کریں گے تو) لازماً گناہ گاروں میں سے ہو جائیں گے۔ پس اگر کسی طرح اطلاع ہو جائے کہ ان دونوں (غیر مسلم گواہوں) نے گناہ کمایا ہے [یعنی غلط گواہی دی ہے] تو میت کے ان قریبی رشتہ داروں میں سے جن کے خلاف گواہی جارہی ہے' دو افراد ان دو (غیر مسلم گواہوں) کی جگہ کھڑے ہو کر اللہ کی قسمیں اٹھائیں گے کہ ہماری گواہی ان دونوں (غیر مسلموں) کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم نے زیادتی نہیں کی' بے شک ہم (اگر زیادتی کریں گے تو) لازماً ظالمین میں سے ہو جائیں گے۔ یہ طریقہ کار زیادہ قریب ہے اس بات کے وہ (غیر مسلم) لوگ اپنی گواہی کو صحیح رخ پر پیش کریں یا وہ اس سے ڈر جائیں کہ ان کی قسمیں کچھ دوسری قسموں سے رد کر دی جائیں گی۔ اللہ سے ڈرو اور سنو۔ اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے سفر کی حالت میں مسلمان عادل گواہ نہ ملنے کی صورت میں دو غیر مسلموں کی گواہی بھی معتبر قرار دی ہے' لیکن ساتھ ہی ایسا طریق کار بتلا دیا کہ جس سے ان غیر مسلموں کی گواہی میں ان کے فسق و فجور یا عدالت کے مجروح ہونے کی وجہ سے جو طعن پیدا ہوتا ہے' اس کا ازالہ ہو سکے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے وقت غیر مسلموں کی شہادت رد کرنے کی بجائے ایسے قرائن کی طرف رہنمائی کی ہے کہ جن سے ان کی شہادت کی تصدیق یا تکذیب ہو سکے۔

کلام مجید میں ایک جگہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ نقل کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِينَ ۝ لَأُعَذِّبَنَّهُۥ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَا۟ذْبَحَنَّهُۥٓ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ ۝ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِۦ وَجِئْتُكَ مِن سَبَإٍۭ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ۝ إِنِّي وَجَدتُّ ٱمْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ۝ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ۝ أَلَّا يَسْجُدُوا۟ لِلَّهِ ٱلَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ قَالَ سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْكَٰذِبِينَ ۝ ٱذْهَب بِّكِتَٰبِي هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَٱنظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ ۝ (النمل)

''حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا: مجھے کیا ہو گیا ہے' میں ہُدہُد کو دیکھ نہیں پا رہا ہوں یا وہ غائب ہے! میں اسے لازماً شدید سزا دوں گا یا اسے ذبح ہی کر ڈالوں گا یا وہ میرے پاس کوئی واضح دلیل (عذر) لے کر آئے۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام نے زیادہ دیر نہیں گزاری (کہ ہُدہُد آ گیا) پس اس نے کہا: میں نے اس چیز کا احاطہ کیا ہے جس کا آپ احاطہ نہیں کر سکے اور میں آپ کے پاس قوم سبا سے ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے وہ ان پر حکمرانی کرتی ہے اور اسے ہر چیز دی

گئی ہے اور اس کے پاس ایک بہت بڑا تخت ہے۔ میں نے اس عورت اور اس کی قوم کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو مزیّن کر دیا ہے پس اس نے انہیں سیدھے رستے سے روک دیا ہے۔ پس وہ اس بات کی طرف رہنمائی نہیں پا سکے کہ وہ اس اللہ کو سجدہ کریں جو زمین یا آسمانوں میں چھپی ہوئی ہر چیز کو نکالتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو۔ اللہ، اس کے سوا کوئی بھی معبود نہیں ہے اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: ہم عنقریب دیکھیں گے کہ تم نے سچ بولا یا تم جھوٹوں میں سے ہو۔ تو میرا یہ خط لے جا اور ان کی طرف ڈال دے پھر ان سے منہ موڑ لے پس دیکھ وہ کیا کیا چیز لوٹاتے ہیں!''

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدہد کی بلا اجازت غیر حاضری نے اس کی خبر اور روایت کو مشکوک بنا دیا تھا۔ پس آیت مبارکہ کے الفاظ ﴿سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝﴾ میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کی خبر کی تصدیق و تکذیب کی بنیاد خارجی قرائن کو بنایا اور بالآخر ایک قرینہ ہی کی بدولت ہدہد کی خبر کی تصدیق کی گئی اور وہ قرینہ ملکہ سبا کی طرف خط کا ڈالنا اور اس کی طرف سے ایلچی کا آنا تھا۔

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عن أبی هريرة رضی الله عنه قال كان أهل الكتاب يقرؤون التوراة بالعبرانية ويفسرونها بالعربية لأهل الاسلام فقال رسول الله ﷺ: ((لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ ﴿وَقُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ﴾ الآية)). (صحيح البخاری، كتاب التوحيد، باب ما يجوز تفسير التوراة وغيرها من كتب الله بالعربية)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہلِ کتاب تورات کو عبرانی میں پڑھتے تھے اور اس کی تفسیر و توضیح اہلِ اسلام کے لیے عربی میں کرتے تھے۔ پس اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اہلِ کتاب کی نہ تو تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو۔ اور کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا...۔''

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی خبر میں عدالت میں طعن کی صورت میں بعض حالات میں بعض خارجی قرائن کی موجودگی میں مخبر کی خبر کو اس قدر تقویت مل جاتی ہے کہ وہ قابل احتجاج ہو جاتی ہے اور 'وہم' سے 'ظن' یا 'علم' کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

## سیّء الحِفظ اور واہم کی خبر کا دین میں حکم

کسی دینی خبر کی صحت کا دوسرا معیار ضبط ہے۔ ضبط میں بھی طعن کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ اگر خارجی قرائن میسر ہوں تو ایسی اخبار قابل احتجاج یا صالح کے درجہ تک تقویت پا جاتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ﴾ (البقرة : ٢٨٢)

''اور تم (قرض کے معاملات میں) اپنے دو مَردوں کو گواہ بنا لیا کرو۔ پس اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد

اور دو عورتیں کافی ہیں' جو تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں' تا کہ ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد کروادے۔''

اس آیت مبارکہ میں قرض کے لین دین کے معاملات میں گواہی کا نصاب بیان ہوا ہے۔ شہادت یا گواہی کا معیار عام خبر سے بڑھ کر ہوتا ہے' کیونکہ شہادت کی بنیاد پر دینی مسائل میں قضا اور عدالتی فیصلے ہوتے ہیں' جبکہ عام خبر کا معاملہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ شہادت کے باب میں اگر ایک عورت اس قدر خفیف الضبط ہے کہ قرض کے ایک معاملہ میں اپنی گواہی دینے کو بھی بھول گئی ہے اور دوسری عورت نے اسے کوئی ایسا اشارہ دیا کہ پہلی عورت کو اپنی گواہی دینے کا فعل یاد آ گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ ایک عورت کے نسیان کی کوتاہی اور عیب کسی دوسری عورت کے یاد کرا دینے سے دور ہو سکتا ہے۔

مالی معاملات میں عورت کی شہادت میں تو کم از کم دو عورتوں کی گواہی معتبر ہے جبکہ خبر میں ایک عورت کی بھی خبر مقبول ہے۔ مالی معاملات میں دو عورتوں کی گواہی لازم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ تجارت اور مالی لین دین ان کا میدان نہیں تھا' لہٰذا عدم دلچسپی کی وجہ سے نسیان کا امکان زیادہ تھا۔ اس کے برعکس دین اسلام کو اگلی نسل تک منتقل کرنا مرد و عورت دونوں کا میدان اور دلچسپی کا موضوع ہے' لہٰذا وہاں اکیلی عورت کی روایت بھی قابل قبول ہے۔

## منقطع روایات کا دین میں حکم

ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ انقطاعِ سند کی تمام صورتیں ایک جیسی نہیں ہیں۔ بعض صورتوں سے خبر میں پیدا ہونے والا ضعف شدید ہوتا ہے جبکہ بعض دوسری صورتوں میں خفیف ہوتا ہے۔ انقطاعِ سند کی صورت میں اگر ضعف خفیف ہو تو قرائن کی بدولت ختم ہو جاتا ہے اور روایت قابل احتجاج ہو جاتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فمن شاهد أصحاب رسول اللّٰه ﷺ من التابعين فحدث حديثا منقطعا عن النبي ﷺ اعتبر عليه بأمور' منها أن ينظر إلى ما أرسل من الحديث' فإن شركه فيه الحفاظ المأمونون فأسندوه إلى رسول اللّٰه ﷺ بمثل معنى ما روى كانت هذه دلالة على صحة من قبل عنه وحفظه' وإن انفرد بإرسال حديث لم يشركه فيه من يسنده قبل ما يفرد به من ذلك ويعتبر عليه بأن ينظر هل يوافقه مرسل غيره ممن قبل العلم عنه من غير رجاله الذين قبل عنهم' فإن وجد ذلك كانت دلالة يقوى به مرسله وهي أضعف من الاولى' وإن لم يوجد ذلك نظر إلى بعض ما يروى عن بعض أصحاب رسول اللّٰه ﷺ قولا له' فإن وجد يوافق ما روى عن رسول اللّٰه ﷺ كانت هذه دلالة على أنه لم يأخذ مرسله إلا عن أصل يصح إن شاء اللّٰه' وكذلك إن وجد عوام من أهل العلم يفتون بمثل معنى ما روى عن النبي ﷺ۔ (الرسالة: ٤٦١۔٤٦٣' دار الكتب العلمية)

''پس جن تابعین کی اللہ کے رسول ﷺ کے صحابہؓ سے ملاقات ہے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ سے کوئی منقطع یعنی مرسل روایت بیان کریں تو چند امور کے سبب سے ان مرسل روایات کا اعتبار کیا جائے گا۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ اس مرسل روایت میں غور کیا جائے' پس اگر اس مرسل روایت کا معنی و مفہوم کچھ عادل

اور ضابط راویوں نے کسی اور مسند روایت میں بھی بیان کیا ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تابعی کی مرسل روایت صحیح اور محفوظ ہے۔ اور اگر صورت یہ ہو کہ تابعی اپنی مرسل روایت میں منفرد ہو اور کوئی اور راوی اس معنی کی مسند روایت نقل نہ کر رہا ہو تو پھر یہ غور کیا جائے گا کہ کیا اہلِ علم تابعین سے مروی کوئی اور مرسل روایت ایسی ہے جو اس پہلی مرسل روایت کی موافقت کر رہی ہو اور اس دوسری مرسل کے راوی بھی اور ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پہلی مرسل روایت اس دوسری مرسل سے قوی ہو جائے گی۔ لیکن اس صورت میں مرسل کی قوت پہلی صورت کی مرسل سے کم ہوگی۔ اور اگر ایسا بھی نہ ہو (یعنی کسی مرسل کی تائید کسی دوسری مرسل سے بھی نہ ہو رہی ہو) تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ کو دیکھا جائے گا۔ پس اگر کسی صحابی کا قول اس مرسل روایت کے موافق ہوا تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس مرسل کی کوئی اصل صحیح ہے، ان شاء اللہ۔ اسی طرح کا حکم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس مرسل کا بھی ہے کہ جس کے معنی و مفہوم کے مطابق عام اہل علم نے فتویٰ جاری کیا ہو۔''

امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

والمراسيل إذا تعددت طرقها وخلت عن المواطأة قصدا أو الاتفاق بغير قصد كانت صحيحة قطعا. فإن النقل إما أن يكون صدقا مطابقا للخبر وإما أن يكون كذبا تعمد صاحبه الكذب أو أخطأ فيه، فمتى سلم من الكذب العمد والخطأ كان صدقا بلاريب. فإذا كان الحديث جاء من جهتين أو جهات وقد علم أن المخبرين لم يتواطأ على اختلافه وعلم أن مثل ذلك لا تقع الموافقة فيه اتفاقا بلا قصد علم أنه صحيح، مثل شخص يحدث عن واقعة جرت ويذكر تفاصيل ما فيها من الأقوال والأفعال ويأتي شخص آخر قد علم أنه لم يواطىء الأول فيذكر مثل ما ذكره الأول من تفاصيل الأقوال والأفعال، فيعلم قطعا أن تلك الواقعة حق في الجملة، فإنه لو كان كل منهما كذبها عمدا أو خطأ لم يتفق العادة أن يأتي كل منهما بتلك التفاصيل التي تمنع العادة اتفاق الاثنين عليها بلامواطأة من أحدهما لصاحبه، فإن الرجل قد يتفق أن ينتظم بيتا وينظم الآخر مثله أو يكذب كذبة ويكذب الآخر مثلها، أما إذا أنشأ قصيدة طويلة ذات فنون على قافية وروى فلم تجر العادة بأن غيره ينشيء مثلها لفظا ومعنى مع الطول المفرط، بل يعلم بالعادة أنه أخذها منه، وكذلك إذا حدث حديثا طويلا فيه فنون وحدث آخر بمثله فإنه إما أن يكون واطأه عليه أو أخذه منه أو يكون الحديث صدقا، وبهذه الطريق يعلم صدق عامة ما تتعدد جهاته المختلفة على هذا الوجه من المنقولات، وإن لم يكن أحدها كافيا إما لإرساله وإما لضعف ناقله. (مجموع الفتاوى: ۱۳/۳٤۷-۳٤۸)

''مرسل روایات کے طرق اگر ایک سے زائد ہوں اور ارادی یا غیر ارادی اتفاقی موافقت سے خالی ہوں (یعنی ان مرسل روایات کے راویوں کے ارادتاً یا اتفاقاً ایک بات پر متفق ہونے کا امکان نہ ہو) تو ایسی روایات قطعی درجہ میں صحیح قرار پائیں گی۔ کوئی بھی روایت یا تو امر واقعہ کے مطابق ہوگی اور سچی ہوگی یا امر واقعہ کے خلاف ہوگی اور جھوٹ ہوگی۔ (امر واقعہ کے خلاف ہونے کی صورت میں) یا تو اس روایت کا

راوی عمداً جھوٹا ہوگا یا وہ مخطی ہوگا۔ پس اگر راوی سے عمداً جھوٹ اور خطا دونوں ہی کی نفی ہو جائے تو اس کی خبر بلاشبہ سچ شمار ہوگی۔ پس اگر کوئی روایت دو یا زائد طرق سے مروی ہو اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس روایت کے مخبرین نے اس کے اختلاف پر آپس میں ملاقات نہیں کی ہے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ اس قسم کی روایات میں بلاقصد اتفاقی موافقت حاصل نہیں ہوتی تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ روایت صحیح ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی واقعہ کا تذکرہ کرتا ہے اور اس واقعہ میں موجود اقوال و افعال کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اور شخص ایسا ہے جس کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ اس نے پہلے سے ملاقات نہیں کی ہے۔ پس وہ بھی اس واقعے کا ذکر کرتا ہے جس کا پہلے نے کیا ہے اور اس میں موجود اقوال و افعال کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ پس اس طرح سے قطعی طور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ واقعہ من جملہ حق ہے۔ کیونکہ اگر تو ان دونوں اشخاص نے عمداً جھوٹ بولا ہو یا خطاً' دونوں صورتوں میں عادت اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ دو افراد نے بغیر باہمی ملاقات کے اس قدر تفصیلی واقعات کو ایک جیسا بیان کر دیا ہو۔ بعض اوقات ایک شاعر ایک شعر کہتا ہے اور دوسرا بھی ویسا ہی شعر کہہ دیتا ہے یا کوئی شخص ایک جھوٹ بولتا ہے اور دوسرا بھی ویسا ہی جھوٹ بول دیتا ہے' لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک شخص نے کئی ایک فنون پر مشتمل کسی قافیہ پر ایک لمبا قصیدہ کہا ہو اور وہ اس سے مروی ہو تو عادت یہ تسلیم نہیں کرتی کہ اس شخص کے علاوہ کوئی اور شخص بھی ایسا ہی قصیدہ لفظاً و معناً اسی قدر طویل صورت میں کہے' بلکہ عادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس صورت میں دوسرے نے ضرور پہلے سے وہ قصیدہ لیا ہوگا۔ پس اسی طرح اگر کوئی شخص ایک لمبی چوڑی (مرسل) روایت بیان کرے کہ جس میں کئی ایک فنون کا بیان ہو اور دوسرا بھی ایسی ہی روایت نقل کرے' پس یا تو دوسرے نے پہلے سے ملاقات کی ہے اور اس سے وہ (مرسل) روایت حاصل کی ہے (اور اگر دوسرے کی پہلے سے ملاقات نہ ہو) تو یہ روایت سچی ہوگی [کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں تابعین کا کوئی مصدر ہے جسے انہوں نے اگرچہ بیان نہیں کیا اور ان تابعین نے جھوٹ بھی نہیں بولا ہے]۔ پس اس طرح سے ایک ایسی روایت کہ جس کے طرق مذکورہ بالا اعتبار سے مختلف ہوں' اس کے عمومی بیانات کی تصدیق کی جائے گی' اگرچہ وہ روایت اپنے اکیلے طریق میں مرسل ہونے کی وجہ سے یا راوی کے ضعف کی وجہ سے کفایت کرنے والی نہ ہوگی۔''

امام ابوداؤد رحمہ اللہ (م ۲۷۵ھ) لکھتے ہیں:

وأما المراسيل فقد كان يحتج بها العلماء فيما مضى مثل سفيان الثورى ومالك بن أنس والأوزاعى' حتى جاء الشافعى فتكلم فيها وتابعه على ذلك أحمد بن حنبل وغيره رضوان الله عليهم. فإذا لم يكن مسند غير المراسيل' ولم يوجد المسند' فالمرسل يحتج به وليس هو مثل المتصل فى القوة." (رسالة إلى أهل مكة : ص ۲۵۔۲۶' المكتب الاسلامى)

''جہاں تک مراسیل کا معاملہ ہے تو سابقہ علماء میں سے سفیان ثوری' امام مالک اور امام اوزاعی رحمہم اللہ ان سے حجت پکڑتے تھے' یہاں تک کہ امام شافعی رحمہ اللہ آئے اور انہوں نے اس بارے میں کلام کیا (اور اس کی قبولیت کی کچھ شرائط مقرر کیں) اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی اس مسئلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کی

متابعت کی (یعنی مرسل کو مطلق طور پر قبول نہ کیا)۔ پس جب مسند موجود نہ ہو اور صرف مرسل روایت ہو تو اس صورت میں مرسل روایت سے حجت پکڑی جائے گی' لیکن وہ قوت میں متصل کے برابر پھر بھی نہ ہوگی۔''

## قرائن کی تشریح وتوضیح

اب ہم اس طرف آتے ہیں کہ وہ کون سے قرائن ہیں جو ایک دینی خبر کو 'وہم' سے 'ظن' اور 'ظن' سے 'علم' کے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ قرائن کئی طرح کے ہیں:

**(۱) مثلاً ایک قرینہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک ضعیف روایت امت کے ہاں خیر القرون اور فقہائے محدثین کے دور میں تلقّی بالقبول کی وجہ سے قابل احتجاج اور صالح ہو جاتی ہے۔**

امام زرکشی (م۷۹۴ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أن الحديث الضعيف إذا تلقته الأمة بالقبول عمل به علی الصحيح' حتی إنه ينزل منزلة المتواتر فی أنه ينسخ المقطوع' ولهذا قال الشافعی فی حديث **"لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ"** إنه لايثبته أهل الحديث ولكن العامة تلقته بالقبول وعملوا به حتی جعلوه ناسخا لآية الوصية للوارث. (النكت علی ابن الصلاح : ۳۹۰/۱' أضواء السلف ' الرياض)

''جب ضعیف روایت کو امت میں تلقّی بالقبول حاصل ہو تو صحیح قول کے مطابق اس پر عمل کیا جائے گا' یہاں تک کہ وہ روایت اس اعتبار سے متواتر کے درجہ کو بھی پہنچ جاتی ہے کہ وہ قطعی طور پر ثابت شدہ حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے 'وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے' والی روایت کے بارے میں کہا ہے کہ محدثین اسے ثابت نہیں مانتے لیکن عوام الناس کے ہاں اس روایت کو تلقّی بالقبول حاصل ہے اور اس پر عمل ہے' یہاں تک کہ یہ روایت (وصیت کے بارے میں) آیت کریمہ کی ناسخ ہے۔''

امام ابن عبدالبر (م۴۶۳ھ) **''هو الطهور ماؤه''** والی روایت پر تبصرہ کرتے ہوتے فرماتے ہیں:

وهذا الحديث لا يحتج أهل الحديث بمثل إسناده وهو عندی صحيح لأن العلماء تلقوه بالقبول له والعمل به. (التمهيد : ۲۱۹/۱۶'مؤسسة القرطبة)

''اس روایت کی سند محدثین کے نزدیک قابل احتجاج نہیں ہے' لیکن میرے نزدیک یہ روایت صحیح ہے' کیونکہ علماء کے ہاں یہ متلقّی بالقبول ہے اور اس پر عمل ہے۔''

اس کی مثال نومولود کے کان میں اذان دینے والی ضعیف روایت بھی ہے' جسے امت میں تلقّی بالقبول کی وجہ سے قابل احتجاج قرار دیا گیا ہے۔

**(۲) اسی طرح کسی ضعیف روایت کا متعدد طرق سے مروی ہونا بھی ایسا قرینہ ہے جو بعض صورتوں میں اس کے ضعف کو ختم کر دیتا ہے۔**

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (م۷۲۸ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والمراسيل إذا تعددت طرقها وخلت عن المواطأة قصدا أو الاتفاق بغير قصد كانت صحيحة قطعا. (مجموع الفتاوی : ۳٤۷/۱۳ )

''مرسل روایات کے طرق اگر ایک سے زائد ہوں اور ارادی یا غیر ارادی اتفاقی موافقت سے خالی ہوں (یعنی ان مرسل روایات کے راویوں کے ارادتاً یا اتفاقاً ایک بات پر متفق ہونے کا امکان نہ ہو) تو ایسی روایات قطعی درجہ میں صحیح قرار پائیں گی۔''

ایک اور مقام پر شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقد يكون الرجل عندهم ضعيفا لكثرة الغلط فى حديثه ويكون حديثه إذا الغالب عليه الصحة لأجل الاعتبار به والاعتضاد به' فإن تعدد الطرق وكثرتها يقوى بعضها بعضا حتى قد يحصل العلم بها ولو كان الناقلون فجارا فساقا' فكيف إذا كانوا علماء عدولا! (مجموع الفتاوىٰ: ٢٦/١٨)

''بعض اوقات ایک راوی محدثین کے نزدیک اپنی روایات میں کثرتِ اغلاط کی وجہ سے ضعیف ہوتا ہے اور اس کی روایت پر دوسری روایات کے اعتبار اور تقویت کی وجہ سے صحت کا حکم غالب ہوتا ہے۔ پس اگر کسی روایت کے طرق قوی اور کثیر ہوں تو یہ روایات ایک دوسرے کو قوی کرتی ہیں' یہاں تک کہ ان سے علم یقینی بھی حاصل ہو جاتا ہے اگرچہ ان کے ناقلین فساق وفجار ہوں۔ پس اگر یہ ناقلین علمائے عدول ہوں تو کیسے یہ علم حاصل نہ ہوگا؟''

امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ونحن إنما لا نقول بالمنقطع إذا كان منفردا' فإذا انضم إليه غيره' أو انضم إليه قول بعض الصحابة' أو ما تتأكد به المراسيل' ولم يعارضه ما هو أقوى منه فإنا نقول به.

(معرفة السنن والآثار' باب الوضوء من مس الذكر)

''اور اگر تو منقطع روایت منفرد ہو تو ہم اس کی بنیاد پر کوئی فتویٰ جاری نہیں کرتے' لیکن اگر اس کے ساتھ کوئی اور روایت یا بعض صحابہ کا قول مل جائے یا اس منقطع روایت کی تائید کچھ مرسل روایات سے ہو جائے اور کوئی زیادہ قوی روایت اس کے مخالف بھی نہ ہو تو ہم ایسی منقطع روایت کی بنیاد پر فتویٰ جاری کرتے ہیں۔''

امام ابن حجر (م ۸۵۲ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومتى توبع السيء الحفظ بمعتبر كأن يكون فوقه أو مثله لادونه' وكذاالمختلط الذى لم يتميز' والمستور' والإسناد المرسل' وكذا المدلس إذا لم يعرف المحذوف منه' صار حديثهم حسنا' لا لذاته' بل وصفه بذلك باعتبار المجموع' من المتابِع والمتابَع' لأن كل أحد منهم احتمال أن تكون روايته صوابا' أو غير صواب' على حد سواء' فإذا جاء ت من المعتبرين رواية موافقة لأحدهم رجح أحد الجانبين من الاحتمالين المذكورين' ودل ذلك على أن الحديث محفوظ' فارتقى من درجة التوقف إلى درجة القبول. (نزهه النظر فى توضيح نخبة الفكر: ص ١٣٠' مطبعة سفير'الرياض)

''اور اگر سیّء الحفظ کی متابعت کسی ایسے معتبر سے ہو جو اس کے برابر یا اس کے اوپر درجے کا ہو اور اس سے کم تر نہ ہو' اسی طرح وہ مختلط جو متمیز نہ ہو' اور مستور الحال اور مرسل اسناد اور اسی طرح مدلّس جبکہ اس میں گرا ہوا راوی معلوم نہ ہو تو ان کی حدیث (معتبر کی متابعت سے) حسن بن جاتی ہے۔ یہ حسن لذاتہ نہیں ہے بلکہ

اس کا یہ (حسن ہونا) وصف مجموعی کے اعتبار سے ہے' یعنی متابع اور متابع کے پہلو سے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں (یعنی متابع اور متابع) برابر کی سطح پر یہ احتمال موجود ہوتا ہے کہ اس کی روایت صواب یا غیر صواب ہو۔ پس جب معتبرین سے کسی ایک راوی کی موافقت میں کوئی روایت مل جائے تو دونوں احتمالات یعنی صواب و غیر صواب میں سے ایک کو ترجیح دے دی جائے گی' اور یہ اس بات کی دلالت ہوگی کہ یہ روایت محفوظ ہے اور درجہ توقف سے درجہ قبول میں چلی گئی ہے۔''

شیخ صالح العثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومن القرائن أن يأتي الخبر نفسه من طرق متعددة' ولو كانت هذه الطرق عن من هذة صفتهم ولكن بدون مواطأة واتفاق' هذه من القرائن' إذ كيف يعقل أناس مختلفين بلا اتفاق وكلا في جهة وكلافي مكان وكلا في بلد لم يلتقوا ولم يتصلوا ببعض' كلهم يأتي وينقل نفس القضية إما بلفظها أو بمعناها' أليست هذه قرينة على صدقهم' وإن كانوا في الأصل كذابين؟! إذا هذه من القرائن التي يتثبت فيها' فقد يقبل بها خبر الفاسق. (شرح مقدمه اصول التفسير للعثيمين : ص ١٥٨)

''اور ان قرائن میں سے یہ بھی ہے کہ خبر کئی ایک طرق سے مروی ہو۔ پس جب یہ طرق ان لوگوں سے مروی ہوں کہ جن کی یہ صفات ہوں اور ان کے راویوں میں کوئی ملاقات اور اتفاق نہ ہو تو یہ قرائن ہیں۔ کیونکہ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ کچھ لوگ بغیر کسی ارادی اتفاق کے' ایک ہی قضیہ کو ایک جیسے الفاظ یا معانی کے ساتھ نقل کر رہے ہوں جبکہ وہ لوگ مختلف مقامات' شہروں یا جہات میں ہوں اور وہ آپس میں ملے بھی نہ ہوں۔ کیا یہ ان افراد کے سچا ہونے کا قرینہ نہیں ہے؟ اگرچہ وہ حقیقت میں جھوٹے ہی کیوں نہ ہوں؟ تو یہ وہ قرائن ہیں کہ جن سے ایک خبر ثابت ہوتی ہے۔ پس ان قرائن کے ساتھ فاسق کی خبر مقبول ہے۔''

**(۳) بعض اوقات ایک ضعیف روایت پر اجماع کا قرینہ بھی اسے درجہ قبولیت تک لے جاتا ہے اور اس روایت کا معنی صحیح ہو جاتا ہے اور وہ سند سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔**

امام ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قال علي وقد يرد خبر مرسل إلا أن الاجماع قد صح بما فيه متيقنا منقولا جيلا فجيلا' فإن كان هذا علمنا أنه منقول نقل كافة كنقل القرآن فاستغنى عن ذكر السند فيه' وكان ورود ذلك المرسل وعدم وروده سواء ولا فرق وذلك نحو "لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ" وكثير من أعلام نبوته ﷺ...وأما المرسل الذي لا اجماع عليه فهو مطروح على ما ذكرنا لأنه لا دليل عن قبوله البتة. (الإحكام في أصول الأحكام : ٢/ ٢٠٠' دار الحديث ' القاهرة)

''امام ابن حزم رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ خبر مرسل مردود ہے الّا یہ کہ اس مرسل روایت کے معنی و مفہوم پر اجماعِ متقین ہو جو نسل در نسل منقول ہو۔ پس اگر کوئی مرسل روایت ایسی ہو کہ اسے ایک بہت بڑی تعداد نقل کر رہی ہو جیسا کہ قرآن منقول ہے تو اس کی سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پس اس صورت میں اس مرسل روایت کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اس کی مثال 'لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ' والی روایت ہے یا آپ ﷺ کی نبوت کی نشانیوں سے متعلق روایات ہیں...اور جہاں تک اس مرسل روایت کا

معاملہ ہے کہ جس پر اجماع نہ ہو تو وہ مردود ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کیونکہ اسے قبول کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔''

**(۴) اس کے علاوہ بھی بہت سے قرائن بیان کیے جا سکتے ہیں لیکن اس وقت مقصود ان قرائن کا احاطہ نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے بعض قرائن کی طرف اشارہ کیا ہے:**

فمن شاهد أصحاب رسول اللّٰهﷺ من التابعين فحدث حديثا منقطعا عن النبيﷺ اعتبر عليه بأمور منها أن ينظر إلى ما أرسل من الحديث' فإن شركه فيه الحفاظ المأمونون فأسندوه إلى رسول اللّٰهﷺ بمثل معنى ما روى كانت هذه دلالة على صحة من قبل عنه وحفظه' وإن انفرد بإرسال حديث لم يشركه فيه من يسنده قبل ما يفرد به من ذلك ويعتبر عليه بأن ينظر هل يوافقه مرسل غيره ممن قبل العلم عنه من غير رجاله الذين قبل عنهم فإن وجد ذلك كانت دلالة يقوى به مرسله وهي أضعف من الاولى' وإن لم يوجد ذلك نظر إلى بعض ما يروى عن بعض أصحاب رسول اللّٰهﷺ قولا له' فإن وجد يوافق ما روى عن رسول اللّٰهﷺ كانت هذه دلالة على أنه لم يأخذ مرسله إلا عن أصل يصح إن شاء اللّٰه' وكذلك إن وجد عوام من أهل العلم يفتون بمثل معنى ما روى عن النبيﷺ۔ (الرسالة : ٤٦١۔٤٦٣' دار الكتب العلمية)

''پس جن تابعین کی اللہ کے رسول ﷺ کے صحابہؓ سے ملاقات ہے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ سے کوئی منقطع یعنی مرسل روایت بیان کریں تو چند امور کے سبب سے ان مرسل روایات کا اعتبار کیا جائے گا۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ اس مرسل روایت میں غور کیا جائے' پس اگر اس مرسل روایت کا معنی و مفہوم کچھ عادل اور ضابط راویوں نے کسی اور مسند روایت میں بھی بیان کیا ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تابعی کی مرسل روایت صحیح اور محفوظ ہے۔ اور اگر صورت یہ ہو کہ تابعی اپنی مرسل روایت میں منفرد ہو اور کوئی اور راوی اس معنی کی مسند روایت نقل نہ کر رہا ہو تو پھر یہ غور کیا جائے گا کہ کیا اہلِ علم تابعین سے مروی کوئی اور مرسل روایت ایسی ہے جو اس پہلی مرسل روایت کی موافقت کر رہی ہو اور اس دوسری مرسل کے راوی بھی اور ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پہلی مرسل روایت اس دوسری مرسل سے قوی ہو جائے گی لیکن اس صورت میں مرسل کی قوت پہلی صورت کی مرسل سے کم ہو گی۔ اور اگر ایسا بھی نہ ہو (یعنی کسی مرسل کی تائید کسی دوسری مرسل سے بھی نہ ہو رہی ہو) تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ کو دیکھا جائے گا۔ پس اگر کسی صحابی کا قول اس مرسل روایت کے موافق ہوا تو یہ اس بات کی دلیل ہو گی کہ اس مرسل کی کوئی اصل صحیح ہے' ان شاء اللہ۔ اسی طرح کا حکم اللہ کے رسول ﷺ سے مروی اس مرسل کا بھی ہے کہ جس کے معنی و مفہوم کے مطابق عام اہلِ علم نے فتویٰ جاری کیا ہو۔''

یہ واضح رہے کہ ہر قرینہ کا درجہ یا وقعت ایک جیسی نہیں ہوتی' لہٰذا ہر قرینہ ہر قسم کے ضعف کو دور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کون سا قرینہ کس قدر ضعف کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس بارے میں کبار ائمہ و فقہائے محدثین' مثلاً امام شافعی' امام بیہقی' امام ابن عبد البر' امام ابن تیمیہ اور امام ابن حجر رحمہم اللہ وغیرہم کے اقوال کا اعتبار ہو گا جنہیں ہم نقل کر چکے ہیں۔

## 'وہم' سے 'ظن' کا سفر طے کرنے والی خبر میں الفاظ ومعانی کا ثبوت

کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں یہ فرق ہے کہ کتاب اللہ میں الفاظ ومعانی دونوں اللہ تعالیٰ کے ہیں جبکہ سنت رسول ﷺ میں معانی تو اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں البتہ الفاظ اللہ کے رسول ﷺ کے ہیں۔ اسی طرح ان دونوں میں ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ میں لفظاً روایت ہوئی ہے' یعنی اس میں ایک ایک حرف محفوظ ہے' جبکہ احادیث میں لفظاً ومعناً روایت ہوئی ہے' یعنی اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ بھی منتقل ہوئے ہیں' جیسا کہ عموماً قولی سنن کا معاملہ ہے اور صحابہ رضوان اللہ اجمعین کے الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں' جیسا کہ فعلی اور تقریری سنن کا بیان ہے۔ پس کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے معنی ومفہوم کے اعتبار سے تو دونوں سے ایک جیسا علم حاصل ہوگا' لیکن کتاب اللہ کے الفاظ اور سنت رسول ﷺ کے الفاظ سے استدلال واستنباط سے حاصل شدہ علم کے درجہ میں کچھ فرق ہوگا' مثلاً کتاب اللہ میں حروفِ عطف واؤ اور فاء وغیرہ سے جو مسائل اخذ کیے جائیں گے' یعنی واؤ جمع کے لیے اور فاء تعقیب کے لیے ہے' تو ان سے تو علم یقینی حاصل ہوگا' لیکن سنتِ رسول ﷺ کے حروفِ عطف سے اگر کوئی مسئلہ اخذ کیا جائے گا تو اس سے علم ظنی حاصل ہوگا' کیونکہ اگر یہ سوال ہو کہ سنتِ رسول ﷺ میں وہ حرفِ عطف اسی طرح باقی ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بتلایا تھا تو یہ ایک ظنّی معاملہ ہے' یعنی اس حرفِ عطف کے بارے میں ظن غالب تو ہو سکتا ہے کہ وہ ویسے ہی ہم تک پہنچا ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے استعمال کیا تھا' لہٰذا اس ظن غالب کی بنا پر ثابت ہونے والے حرف سے ثابت مسئلہ بھی ظنی ہوگا اور اسے قطعی یا علم کا درجہ دینا مناسب نہیں ہے۔

اسی طرح قرائن کی بدولت 'وہم' سے 'ظن' تک کا سفر کرنے والی روایت مثلاً حسن لغیرہ وغیرہ سے من جملہ مسئلہ تو ثابت ہو جائے گا لیکن اس کے الفاظ ثابت نہ ہوں گے اور ان سے استدلال بھی درست نہیں ہوگا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لکن مثل هذا لا تضبط به الألفاظ والدقائق. (مجموع الفتاوی : ۳۴۷/۱۳-۳۴۸)

''لیکن اس قسم کی روایت سے الفاظ کا اثبات اور دقیق نکات نکالنا مناسب امر نہیں ہے۔''

شیخ صالح العثیمین لکھتے ہیں:

لکن مثل هذا لا نضبط به الألفاظ والدقائق' فلو کان الخبر یتوقف علی لفظة حکم أو تقریر قضیة' فنقول : مادام هذه سبیله لا یثبت به لفظ' فإن هذه الطریقة فی إثبات الأخبار یثبت بها أصل الحدیث أو الخبر أو القضیة أو القصة' لکن لا نستطیع أن ندیر حکما علی اللفظ' وهذه نقطة مهمة جدا خاصة للفقیه الذی یرید أن یستنبط الأحکام. (شرح مقدمه اصول التفسیر للعثیمین : ص ۱۵۸)

''لیکن اس قسم کی روایت سے الفاظ اور دقیق نکات ثابت نہیں ہوتے۔ پس اگر خبر کسی حکم یا قضیے کے اثباتِ لفظی پر متوقف ہو تو ہم یہی کہیں گے: جب تک اس خبر کا معاملہ ایسا ہے (یعنی یہ قرائن سے قوت پکڑ رہی ہے) تو اس سے روایت کے الفاظ ثابت نہیں ہوتے۔ کسی خبر کو اس طرح ثابت کرنے کے طریق کار میں

حدیث یا خبر یا قضیہ یا قصہ کی اصل تو ثابت ہو جاتی ہے لیکن ہم اس بات کی استطاعت نہیں رکھتے کہ حکم کو اس روایت کے الفاظ کے گرد گھمائیں۔ یہ بہت ہی اہم ہے' خاص طور پر اس فقیہہ کے لیے جو احکام کو مستنبط کرنا چاہتا ہے۔''

اس کی مثال وہ روایت ہے جو سنن ترمذی میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

فقال: كيف تقضي؟ فقال: أقضي بما في كتاب الله' قال: فإن لم يكن في كتاب الله؟ قال: فبسنة رسول اللهﷺ قال: فإن لم يكن في سنة رسول الله' قال: اجتهد رأيي. (سنن الترمذي' كتاب الأحكام عن رسول الله'باب ما جاء في القاضي كيف يقضي)

''آپ ﷺ نے کہا: تم کیسے فیصلہ کرو گے؟ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: جو کتاب اللہ میں ہے' اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا: اگر وہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: تو میں سنتِ رسول ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا (کیونکہ اس میں صراحت اور تفصیل قرآن کی نسبت زیادہ ہے)۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اگر وہ سنتِ رسول ﷺ میں بھی نہ ہو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔''

یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے 'ضعیف' ہے' لیکن جن علماء نے اس حدیث کو قابل احتجاج قرار دیا ہے' وہ درج ذیل ہیں۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو 'صحیح' کہا ہے (شرح مشكل الآثار : ٢١٢/٩)۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے 'صحیح مشہور' کہا ہے (جامع بيان العلم وفضله : ٨٤٤/٢)۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے بھی اسے 'صحیح مشہور' کہا ہے (عارضة الأحوذي : ٣٠٠/٣)۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے 'اسنادہ جید' کہا ہے (مجموع الفتاوى : ٣٦٤/١٣)۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسے 'اسنادہ جید' کہا ہے (تفسير القرآن: ١٣/١)۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو 'قابل احتجاج' قرار دیا ہے۔ (إعلام الموقعين : ١٨٣/١)۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے اسے 'حسن الأسناد ومعناه صحيح' کہا ہے (تلخيص العلل المتناهية : ٢٦٩)۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس کو 'حسن لغیرہ معمول بہ' کہا ہے (الفتح الرباني : ٤٤٨٥/٩)۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے 'غریب وموقوف' کہا ہے (موافقة الخبر الخبر: ١١٩/١)۔

اصل نکتہ یہ ہے کہ ان اہلِ علم کے نزدیک اس روایت کا متن درست ہے اور اس روایت سے اس قدر استدلال کرنا صحیح ہے کہ کتاب وسنت کے علاوہ استنباطِ احکام میں اجتہاد کا بھی ایک مقام ہے' لیکن اس روایت کے الفاظ سے کوئی خاص نکتہ نکالنا درست نہیں ہے' کیونکہ قرائن سے اس روایت کے الفاظ ثابت نہیں ہوتے بلکہ من جملہ مفہوم ثابت ہو جاتا ہے۔

بعض متجددین نے اس روایت کے الفاظ 'اَجْتَهِدُ رَأْيِي' سے یہ اخذ کیا ہے کہ اجتہاد کی بنیاد انسان کی کتاب وسنت کے علاوہ ذاتی رائے ہوتی ہے تو یہ استدلال اصولاً بھی غلط ہے اور معناً بھی۔ اصولاً اس لیے کہ قرائن کی بنیاد پر قوی ہونے والی روایت کے الفاظ ثابت نہیں ہوتے' لہٰذا الفاظ سے استدلال درست نہیں ہے

اور معناً اس لیے کہ 'اَجْتَھِدُ رَأْیِی' کا صحیح معنی ہے: میں (کتاب وسنت) میں اپنی پوری کوشش صرف کروں گا اپنی رائے بنانے میں۔ واللہ اعلم بالصواب!

## چند شبہات کا ازالہ

ضعیف روایت کے قرائن کی تائید سے قابل احتجاج ہونے کے بارے میں چند معروف شبہات کے جوابات یوں دیے جاسکتے ہیں۔

## پہلا اعتراض

بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب تعددطرق سے ایک ضعیف روایت قابل احتجاج ہو جاتی ہے تو ہر جگہ ایسا کیوں نہیں کیا جاتا کہ تعددِ طرق کی بنیاد پر کسی روایت کو قابل احتجاج قرار دیا جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ قرائن یعنی تلقی بالقبول یا تعددِ طرق وغیرہ سے بعض ضعیف روایات کا ضعف ختم ہو جاتا ہے اور وہ قابل احتجاج ہو جاتی ہیں' لیکن اس میں ان کے الفاظ قابل احتجاج نہیں ہوتے بلکہ معنی قابل احتجاج ہوتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ضعیف روایت کا یہ معنی بھی اس صورت میں قرائن کی تائید سے قابل احتجاج ہوتا ہے جبکہ وہ معنی دیگر شرعی احکام کے خلاف نہ ہو۔ پس اگر ایک ضعیف روایت کچھ طرق سے مروی ہو تو اس کا معنی قابل احتجاج ہو جائے گا' لیکن اگر اس روایت کا معنی کتاب اللہ یا صحیح سنّتِ رسول سے ثابت شدہ عقائد واحکام کے خلاف ہو گا تو اس صورت میں ہم یہی کہیں گے کہ کتاب اللہ اور سنّتِ صحیحہ کا مفہوم ان قرائن میں مانع ہے جو متعدد طرق سے مروی ضعیف کو درجہ توقف سے درجہ قبولیت تک پہنچاتے ہیں۔ پس اس مانع کی موجودگی میں اس روایت پر قابل احتجاج ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

مثلاً قصہ غرانیق والی روایت کئی ایک ضعیف طرق سے مروی ہے۔ پس اہل علم کی ایک جماعت اس روایت کے متعدد طُرق کے باوجود اس کو قابل احتجاج قرار نہیں دیتی۔ ان کے نزدیک اس کے درجہ توقف سے درجہ قبولیت میں پہنچنے میں عصمتِ انبیاء اور حفاظتِ کلامِ الٰہی کا بنیادی عقیدہ مانع ہے' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ (فُصِّلَت:٤٢) یعنی باطل اس کلامِ الٰہی کے نہ تو آگے سے آسکتا ہے اور نہ ہی پیچھے سے۔ لہٰذا اس ضعیف روایت کے متعدد طرق ہونے کے باوجود اس کا معنی ثابت نہیں ہو گا اور اس کے قرائن اسے کوئی فائدہ نہیں دیں گے۔ جبکہ اہل علم کی ایک دوسری جماعت اس روایت کے معنی کا اثبات کرتی ہے اور ان کے نزدیک اس روایت کے الفاظ ثابت نہیں ہیں اگرچہ اس واقعہ کی کوئی اصل موجود ہے۔ یہ اہل علم اس واقعہ کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ 'تلك الغرانیق العلٰی' والے الفاظ اللہ کے رسول ﷺ کی زبان سے ادا نہیں ہوئے تھے لیکن کفار نے ان الفاظ کو شیطان کی طرف سے سنا تھا اور ان الفاظ کو سنانے میں مقصود مشرکین کی آزمائش تھی اور ﴿فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ﴾(الحج:٥٢) کے ذریعے شیطان کی ملاوٹ کو ختم کر کے کلامِ الٰہی کی حفاظت کر دی گئی۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس قصہ کی بعض اسناد کو ابوالعالیہ' قتادہ اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ اجمعین تک صحیح قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

## دوسرا اعتراض

ایک اعتراض یہ بھی وارد کیا جاتا ہے کہ متقدمین محدثین نے 'حسن لغیرہ' کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہے اور یہ متاخرین کی اصطلاح ہے۔

ہمارے خیال میں یہ اعتراض بھی درست نہیں ہے' کیونکہ اصول کے علوم کی تدوین درجہ بدرجہ ہوئی ہے' مثلاً صحابہ' تابعین اور تبع تابعین اصولِ فقہ کی ان اصطلاحات کا نام استعمال نہیں کرتے تھے جو اصولِ فقہ کے دَورِ تدوین میں اس کی امہات الکتب میں مدوّن ہوئیں۔ البتہ صحابہ' تابعین اور تبع تابعین کے ہاں اصول فقہ کی ان اصطلاحات اور اصول وقواعد کے تصورات ضرور موجود تھے۔ اسی طرح اصولِ حدیث کا علم بھی درجہ بدرجہ مدون ہوا ہے اور اس میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ معانی اور تصورات کے لیے اصطلاحات وضع ہوئی ہیں' بلکہ اصطلاح تو کہتے ہی اسے ہیں جس پر ایک جماعت کی صلح ہوئی ہو۔ یعنی اصطلاح ایک جماعت کے اتفاق کے بعد اصطلاح قرار پاتی ہے اور جماعت کا اتفاق ایک دن' مہینے یا سال میں حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے صدیاں لگتی ہیں۔

پس حسن لغیرہ کا تصوّر تو متقدمین حدیث میں موجود تھا' جیسا کہ امام مالک (م ۱۷۹ھ) اور بعض متقدمین علماء مرسل روایت کو قبول کرتے تھے جبکہ ثقہ تابعی سے اس کی روایت کا قرینہ موجود ہوتا تھا۔ اسی طرح امام شافعی (م ۲۰۴ھ) رحمہ اللہ بھی بعض شرائط کے ساتھ مرسل روایت کو قبول کرتے تھے۔ علاوہ ازیں احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) رحمہ اللہ فضائل یا رقائق سے متعلق ضعیف روایات پر عمل کو جائز سمجھتے تھے جبکہ قرائن سے ان کو تقویت پہنچ رہی ہوتی تھی۔ اسی طرح امام ترمذی (م ۲۷۹ھ) رحمہ اللہ بعض اوقات ایسی ضعیف روایات کو جو کئی طرق سے مروی ہوں' حسن کا نام دے دیتے ہیں۔ اس طرح امام ابوداؤد (م ۲۷۵ھ) رحمہ اللہ بعض اوقات ایسی ضعیف روایات کو جو ایک سے زائد طرق سے مروی ہوں' صالح کا نام دیتے ہیں۔

اس کے بعد امام ابن الصلاح (م ۶۴۳ھ) نے 'الحدیث الحسن قسمان' کے نام سے 'حسن' کی دو قسمیں بنائیں اور بعض ضعیف روایات کو تعدد طرق کی بنا پر قابل احتجاج قرار دیا' جبکہ امام ابن حجر (م ۸۵۲ھ) رحمہ اللہ نے باقاعدہ 'حسن لغیرہ' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمارا یہاں یہ دعوی ہرگز نہیں ہے کہ امام مالک و امام شافعی رحمہما اللہ کی مرسل' امام احمد رحمہ اللہ کی ضعیف' امام ترمذی رحمہ اللہ کی حسن' امام ابوداؤد رحمہ اللہ کی صالح' امام ابن الصلاح رحمہ اللہ کی حسن اور امام ابن حجر رحمہ اللہ کی حسن لغیرہ ایک ہی شے ہیں۔ ہمارا مقصود یہاں صرف یہ ہے کہ قرائن کی بنیاد پر ضعیف روایت کے قابل احتجاج ہونے کا نقطہ نظر مختلف اصطلاحات' کیفیات اور حالات کے ساتھ ہر دور میں محدثین کے ہاں مقبول رہا ہے' جیسا کہ ہم اصول فقہ میں دیکھتے ہیں کہ 'اجتہاد' کے سب قائل ہیں لیکن امام شافعی رحمہ اللہ سے لے کر امام شوکانی رحمہ اللہ تک 'اجتہاد' کی تعریف اور تصورات میں فرق بھی مختلف مکاتب فکر میں ملحوظ ہیں' مثلاً امام شافعی' امام ابن حزم اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ کا نظریہ اجتہاد ہر اعتبار سے ایک نہیں ہے اگرچہ اجتہاد کے بنیادی تصور کے قائل سب ہی ہیں۔ یہی معاملہ اس ضعیف روایت کا بھی ہے جو قرائن کی بدولت قوی ہو جاتی ہے کہ اس کے قائل سب ہی ہیں اگرچہ تفصیلات میں اختلاف ہے۔

## تیسرا اعتراض

ایک اعتراض یہ بھی وارد کیا جاتا ہے کہ 0+0=0 ہوتا ہے' لہٰذا ضعیف+ضعیف =0 ہے۔

ہم اس بات کی وضاحت تفصیل سے کر چکے ہیں کہ ضعیف =0 والی بات عقل ونقل کے خلاف ہے۔ موضوع روایت کے بارے میں zero کہنا تو درست ہوسکتا ہے لیکن ضعیف کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے' ورنہ تو موضوع اور ضعیف میں فرق کیا ہوا؟ اور جب ہر ضعیف روایت zero کے برابر ٹھہری تو اس کی سترہ یا اس سے زائد قسموں میں فرق کرنے کا کیا مقصد ہے؟

ہم یہ بات تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ ضعیف روایت zero سے 50 کے درمیان کسی درجہ میں ہوتی ہے اور اس میں سچ کے پہلو کے مرجوح ہونے کی وجہ سے قائل کی طرف اس کی نسبت ضعیف اور کمزور ہوتی ہے یا وہم کے درجہ میں ہوتی ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں یہ وہم مختلف قرائن کی وجہ سے تقویت حاصل کر لیتا ہے اور درجہ وہم سے 'ظن غالب' یا 'علم' کے درجہ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ اس خبر میں وہم 'ظن غالب' یا 'علم' کے درجہ کو پہنچا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ ماہرین فن یعنی محققین محدثین کریں گے' کیونکہ یہ ان کا میدان ہے اور ان کی زندگیاں حدیث کی خدمت میں کھپ جاتی ہے۔ پس محدثین کے بالمقابل عوام یا طلبۃ العلم یا اہل فقہ کے ہاتھ میں یہ اختیار دے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی مہلک بیماری کی تشخیص میں کسی عطائی یا ڈسپنسر یا انجینئر کی رائے پر عمل کیا جائے۔ جس طرح یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سب سے بڑا محدث ہی سب سے بڑا فقیہہ ہوتا ہے' اسی طرح کسی فقیہہ کو سب سے بڑا محدث مان لینا بھی ایک ظلم عظیم ہے۔ یہاں مختلف علوم وفنون ہیں' ہر فن کے اپنے رجال کار ہیں اور اس فن کی باریکیوں میں انہی کی رائے معتبر ہوگی جنہوں نے اس فن کی خدمت میں اپنی زندگیاں کھپائی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

## چوتھا اعتراض

ایک ممکنہ اعتراض یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم نے سابقہ صفحات میں جو حوالہ جات پیش کیے ہیں' ان کی روشنی میں فاسق اور متہم بالکذب کی روایت بھی بعض صورتوں میں قابل قبول ہوسکتی ہے جبکہ محدثین عظام مثلاً ابن حجر رحمہ اللہ نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ ایک فاسق یا متہم بالکذب کی روایت حسن لغیرہ کے درجہ تک پہنچ سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا اس وقت موضوع 'حسن لغیرہ' نہیں ہے' بلکہ ہمارا موضوع عام ہے' اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مختلف درجات کی ضعیف روایات متفرق قرائن کی روشنی میں قابل احتجاج ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہم نے اس کا عنوان 'وہم سے علم تک' رکھا ہے کہ بعض اوقات ایک خبر 'وہم' کے درجہ میں ہوتی ہے لیکن قرائن متفرقہ کی تائید کے بعد 'ظن غالب' یا 'علم' کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ شرعی دلائل کی روشنی میں ایک فاسق اور متہم بالکذب کی روایت بھی قابل احتجاج ہو جاتی ہے لیکن اس کے لیے مضبوط قرائن کی ضرورت ہے۔ اب کیا ایک فاسق یا متہم بالکذب کی روایت کا ضعف ایک دوسرے ضعیف طریق سے دور ہو جاتا ہے؟ یعنی کیا عدالت میں طعن کی بنیاد پر ایک ایسی ضعیف روایت کے لیے ایک دوسری ضعیف روایت ایسا قرینہ ہے کہ وہ پہلی روایت کو

'وہم' سے 'ظن غالب' کے درجہ میں پہنچا دے تو امام ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی نفی فرمائی ہے۔ یعنی انہوں نے اس کی نفی نہیں فرمائی ہے کہ متہم بالکذب یا فاسق کی روایت کبھی قابل احتجاج ہو ہی نہیں سکتی' بلکہ انہوں نے ایک سے زائد طرق سے مروی قرینے کی قوت کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ وہ قوت اس درجہ کی نہیں ہوتی کہ اس سے ایک متہم بالکذب یا فاسق کی ضعیف روایت میں ضعف کا انجبار ممکن ہو۔ پس امام ابن حجر رحمہ اللہ اس فن ومیدان کے رجال میں سے ہیں اور یہ طے کرنا کہ کسی حدیث کا ضعف کس قدر یا درجہ کا ہے اور اس کے اس ضعف کو ختم کرنے کے لیے کس قدر قوی قرینے کی ضرورت ہے' اس بارے میں امام صاحب رحمہ اللہ اور ان جیسے محدّثین عظام کی رائے ہمارے نزدیک بہت ہی محترم اور قابل اعتماد ہے۔

آخر میں ہم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ مضمون ایک علمی مسئلہ میں اہل علم کی ایک غالب جماعت کی ترجمانی کے لیے تحریر کیا گیا ہے اور اس سے مقصود کسی مناظرہ ومباحثہ کا آغاز کرنا نہیں ہے' جیسا کہ ہمارے ہاں بعض رسائل میں اس موضوع سے متعلق ایک بحث 'حسن لغیرہ' کے ضمن میں فریقین کی جانب سے شدید نقد وتعاقب اور بعض اوقات تو طعن وطنز بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ امکان ہے بعض اصحابِ علم وفضل کو اس نقطہ نظر سے اختلاف بھی ہو اور ان کے پاس اپنے موقف کے اثبات کے دلائل بھی ہوں۔ پس اس مسئلہ میں ضرورت اس امر کی ہے کہ جانبین ایک دوسرے کے موقف کے لیے تحمل اور برداشت کا رویہ پیدا کریں اور ممکن حد تک کسی مناظرانہ اور مباحثانہ فضا سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے موقف اور اس کے دلائل کو مثبت انداز میں بیان کر دیا جائے۔ جس کے موقف اور استدلال میں جان ہوگی' وہ اہل علم اور خواص میں عام ہو جائے گا۔ اور اپنا موقف واضح کر دینے کے بعد اتنا کہہ دینا کافی ہے:

﴿اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۵﴾ (الشوریٰ)

❁❁❁


دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے  اشاعت عام: 25 روپے

# المُصنَّف فی الاحادیث والآثار

## (مُصنّف ابن ابی شیبہ)

حافظ حامد حماد☆

### تعارفِ مؤلّف

**حسب ونسب:** آپ کا نام عبداللہ بن محمد بن ابراہیم ابوشیبہ بن عثمان بن خواشتی الکوفی اور آپ کی کنیت ابوبکر ہے۔آپ کی کنیت میں اہلِ تراجم واصحاب الرّجال کا کوئی اختلاف نہیں۔آپ ابن ابی شیبہ العبسی سے پہچانے جاتے ہیں۔ امام سمعانی کہتے ہیں: عبس بطن من غطفان کہ 'عبس' 'غطفان' سے ہے۔اگرچہ 'عبس' اور بھی ہیں مگر آپ کا تعلق اس عبس سے ہے جو غطفان کی ایک شاخ ہے۔آپ کے آباء واَجداد اور خاندان اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

**ولادت:** آپ کی پیدائش کے بارے میں ابن ابی زبیر(۱) نے تاریخ مولد العلماء ووفیاتھم میں اور خطیب بغدادی(۲) نے تاریخ بغداد میں کہا ہے کہ آپ ۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے۔

**خاندان:** آپ کا تعلق ایک علمی اور مشہور خاندان سے ہے' جیسا کہ اصحاب الرجال نے اس کا ذکر کیا ہے۔امام ذہبیؒ فرماتے ہیں:

" ..... أخو الحافظ عثمان بن أبی شیبة والقاسم بن أبی شیبة الضعیف' فالحافظ ابراهیم بن أبی بکر هو ولده' والحافظ أبوجعفر محمد بن عثمان هو ابن أخیه' فهم بیت علم' وأبوبکر أجلهم....." (۳)

''آپ عثمان بن ابی شیبہ اور قاسم بن ابی شیبہ ضعیف کے بھائی ہیں —— اور حافظ ابراہیم بن ابوبکر آپ کا بیٹا ہے' جبکہ حافظ ابوجعفر محمد بن عثمان آپ کا بھتیجا ہے۔آپ کا گھرانہ ایک علمی گھرانہ ہے اور اس گھرانہ میں ابوبکر علم وفضل میں سب سے بڑھ کر ہیں۔''

یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی فرماتے ہیں:

" أولاد ابن ابی شیبة من أهل العلم 'کانوا یزاحموننا عند کل محدث"

''ابن ابی شیبہ کی اولاد بھی اہلِ علم میں سے ہے اور وہ ہر محدث کے پاس اپنے علم کی پیاس بجھانے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔''

**طلب علم اور علمی سفر:** ابن ابی شیبہ کا آبائی وطن کوفہ ہے۔ادھر ہی آپ پلے بڑھے' جوان ہوئے اور وفات پائی۔لہٰذا آپ نے کوفہ کے اکثر اساتذہ سے علم حاصل کیا اور ان کے علم کو اپنے ذہن میں محفوظ کیا۔مگر اس پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ آپ نے حصولِ علم کے لیے بصرہ و بغداد کا بھی سفر کیا اور ان دنوں یہی علاقے علم وعلماء کا مرکز ہوا

☆ ریسرچ فیلو' پی ایچ ڈی' پنجاب یونیورسٹی

کرتے تھے۔عراق کے بعد آپ نے حجاز کے لیے رخت سفر باندھا جیسا کہ امام ذہبی آپ کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" سمع منه ..... وخلق كثير بالعراق و الحجاز و غير ذلك ۔"

''عراق وحجاز وغیرہ کے بہت سے لوگوں نے آپ سے سماع کیا۔''

یہ بھی یادرہے کہ آپ نے اپنی ابتدائی عمر ہی میں علم حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔اس بات کا تذکرہ امام ذہبی نے بھی کیا ہے۔امام ذہبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"طلب أبو بكر العلم وهو صبى ' وأكبر شيخ له شريك بن عبدالله القاضى' ومن أبى الأحوص سلام بن سليم' وعبدالسلام بن حرب"

''ابوبکر ابھی بچے ہی تھے کہ طلب علم شروع کر دی' آپ کے سب سے بڑے استاذ شریک بن عبداللہ قاضی ہیں۔آپ نے ان سے' ابوالاحوص سلام بن سلیم سے اور عبدالسلام بن حرب سے سماعت کی ہے۔''

امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد اور امام نسائی رحمہم اللہ وغیرہ نے آپ سے اور آپ کے شاگردوں سے روایات لی ہیں' مگر امام ترمذی نے اپنی جامع میں ان سے کوئی روایت نہیں لی۔آپ سے ان لوگوں نے بھی روایت لی ہے: محمد بن سعد الکاتب' محمد بن یحییٰ' امام احمد بن حنبل' ابوزرعہ رازی ابوبکر بن ابو عاصم اور ابوحاتم الرازی رحمہم اللہ وغیرہ۔

آپ احمد بن حنبل' یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی رحمہم اللہ کے ہم عصر وہم پایہ ہیں۔

**عقیدہ ونظریات:** آپ کا تعلق اہلِ سنت والجماعت سے سمجھا جاتا ہے اور ان ہی میں آپ کو شمار کیا جاتا ہے' بلکہ آپ اہلِ سنت کے اماموں میں سے ہیں اور اس بات کی شہادت درج ذیل دلائل سے ملتی ہے:

(ا) آپ نے جو کتابیں تصنیف فرمائی ہیں وہ آپ کے عقیدے کی غمازی کرتی ہیں۔ان میں سے ایک کتاب ''کتاب الایمان'' ہے' جو یہ شیخ البانی کی تحقیق سے چھپ چکی ہے۔اس کے اندر مسئلہ ایمان پر گفتگو کی گئی ہے اور اہلِ سنت کا عقیدہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خوارج اور مرجئہ پر رد بھی کیا گیا ہے۔

اسی طرح آپ کی ایک کتاب ''کتابُ السُّنة'' ہے۔شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے **فتوی حمویه** میں توحید اسماء وصفات پر مشتمل کتب کا ذکر کرتے ہوئے اسے ابن ابی شیبہ کی طرف منسوب کیا ہے(٤)۔آپ کی کتب میں سے ایک کتاب ''**كتاب الرد على أبى حنيفة**'' ہے۔یہ مطبوعہ 'المُصنَّف' کے آخر میں چھپی ہوئی ہے۔آپ کی تصانیف میں سے ایک کتاب ''**كتاب العرش**'' ہے۔یہ بھی آپ کے عقیدے کو واضح کرتی ہے۔آپ کی سب سے مشہور اور اہم کتاب آپ کی 'مصنف' ہے۔اس کی ابواب بندی ہی اس کے مؤلف کے عقیدے کی ترجمان ہے۔کتاب کے ابواب دیکھتے ہی پتا چلتا ہے کہ آپ کا عقیدہ وہی ہے جو اہلِ سنت کا عقیدہ ہے۔

(ب) آپ کے 'سُنّی' ہونے کی شہادت امام لالکائی نے بھی دی ہے۔انہوں نے مسئلہ خلقِ قرآن کے تحت آپ کا اور آپ کے بھائی عثمان کا تذکرہ ان ائمہ کے ضمن میں کیا ہے جو ائمہ اہلِ سنت اور داعی ہدایت شمار کیے جاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے بعد جنہوں نے آپؐ کے مشن کو سنبھالا۔(٥)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام ابن ابی شیبہ کے تلامذہ میں سے کسی نے آپ سے کہا: ''قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور یہ مخلوق نہیں ہے''۔اس کے بعد میں نے ابن ابی شیبہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

" من لم يقل هذا فهو ضال مضل مبتدع" (٦)

''جو شخص اس کا قائل نہ ہو وہ خود بھی گمراہ ہے' اوروں کو بھی گمراہ کرنے والا بدعتی ہے۔''

(ج) امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنے مشہورِ زمانہ قصیدہ ''نونیہ'' میں ابن ابی شیبہ کی کتاب 'کتاب العرش' کا حوالہ دیا ہے اور انہیں ائمہ اہلِ حدیث یعنی اہلِ سنت میں شمار کیا ہے۔ (۷)

(د) متوکل باللہ نے آپ کو اور آپ کے بھائی عثمان کو بغداد بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو ایسی احادیث سنائیں اور بیان کریں جن میں معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کی تردید ہو اور جن میں رؤیت باری تعالیٰ کا اثبات ہو۔ (۸)

جرح وتعدیل: علماء جرح وتعدیل آپ کی عدالت وثقاہت اور حفظ واتقان پر متفق ہیں۔ امام عجلی (۲۶۱ھ) آپ کو ثقہ لکھتے ہیں۔ امام ابو حاتم الرازی (۲۲۷ھ) نے بھی آپ کو ثقہ لکھا ہے۔ امام ابن حبان نے آپ کے بارے میں لکھا ہے:

"وكان متقنا حافظا دينا، ممن كتب وجمع وصنف وذاكر"

''آپ حافظ و متقن تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے احادیث لکھیں، جمع کیں، احادیث کی کتب تصنیف کیں اور انہیں یاد رکھا۔''

ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں شمار کیا ہے۔ امام دار قطنیؒ نے آپ کو حافظ کہا ہے۔ امام ذہبیؒ آپ کے بارے میں **الحافظ الكبير الحجة** کا فیصلہ فرماتے ہیں، جبکہ ابن حجرؒ نے بھی آپ کو ثقہ، حافظ اور صاحبِ تصانیف کہا ہے۔

مرتبہ وقدر ومنزلت: یوں تو ابن ابی شیبہ کی بہت تعریف کی گئی ہے مگر یہاں صرف امام ذہبی کے صرف چند کلمات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور یہ کلمات انہوں نے **سير اعلام النبلاء** میں لکھی ہیں۔

" الامام العلم، سيد الحفاظ و صاحب الكتاب الكبار ...... وكان بحرا من بحور العلم، و به يضرب المثل في قوة الحفظ ...... و قال عمرو بن علي الفلاس : ما رأيت أحدا أحفظ من أبي بكر بن أبي شيبة ......  وقال الامان أبو عبيد : انتهى الحديث إلى أربعة : فأبوبكر بن أبي شيبة أسردهم له، وأحمد بن حنبل أفقههم فيه، و يحيى بن معين أجمعهم له، و علي بن المديني أعلمهم به ......

''امام، عالم، حفاظ کے سردار اور بڑی کتابوں کے مصنف ہیں ......علم کے دریاؤں میں سے ایک دریا ہیں۔ ان کی قوتِ حافظہ کی مثال بیان کی جاتی ہے......عمرو بن علی فلاس نے کہا میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ ابوعبید نے کہا کہ حدیث کا علم چار لوگوں پر ختم ہے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ ان چار افراد میں حدیث کو بیان کرنے میں سب سے بڑھ کر ہیں۔ امام احمد بن حنبل حدیث کو سمجھتے ہیں، امام یحیٰی بن معین حدیث کی جمع میں اور علی بن مدینی اس کے علم میں سب سے بڑھ کر ہیں۔''

قال الحافظ ابوالعباس بن عقدة : سمعت عبد الرحمٰن بن خراش يقول : سمعت أبا زرعة يقول : ما رأيت احفظ من أبي بكر بن ابي شيبة...... قال الخطيب : كان أبو بكر متقنا حافظا، صنف المسند والأحكام والتفسير وحدث ببغداد هو وأخواه القاسم وعثمان ...... " (٩)

''حافظ ابوالعباس بن عقدہ کہتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن خراش سے سنا اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوزرعہ سے سنا کہ وہ کہتے ہیں: میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر کوئی حافظ (حدیث) نہیں دیکھا......

خطیب بغدادی کہتے ہیں ابوبکر متقی اور حافظ تھے۔ مسند' احکام اور تفسیر میں کتب تصنیف کیں۔ انہوں نے اوران کے بھائیوں قاسم اور عثمان نے بغداد میں حدیث بیان کی۔''

اس کے بعد احمد بن محمد بن مربع تک سند نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"سمعت أبا عبيد يقول : ربانيو الحديث أربعة : فأعلمهم بالحلال والحرام أحمد بن حنبل ' وأحسنهم سياقة للحديث و أداء على بن المدينى ' وأحسنهم وضعا لكتاب أبوبكر بن أبى شيبة ' وأعلمهم بصحيح الحديث وسقيمه يحيى بن معين ." (۱۰)

''میں نے ابوعبید سے سنا ہے کہ حدیث کے علمائے ربانی چار افراد ہیں۔ حلال وحرام کی احادیث کا سب سے زیادہ علم امام احمد بن حنبل کے پاس ہے۔ حدیث کو بیان کرنے میں سب سے بہتر علی بن مدینی ہیں۔ حدیث کی کتاب تصنیف کرنے میں سب سے بہتر ابن ابی شیبہ ہیں اور صحیح وضعیف کی پہچان کے سب سے بڑے عالم یحییٰ بن معین ہیں۔''

اور امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ (۴۳۲/۲) میں آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

" الحافظ عديم النظير' الثبت التحرير" (۱۱)

یعنی آپ حافظ' عدیم المثل ہیں اور تحریر میں پختہ ہیں۔

**تالیفات:** (۱) **المُصنّف:** یہ آپ کی سب سے زیادہ مشہور اور اہم کتاب ہے۔ جب ''أخرجه ابن أبى شيبة'' مطلقاً بولا جائے تو اس سے یہی کتاب مراد ہوتی ہے۔

(۲) **المُسند:** بعض لوگ مصنف اور مسند کو ایک سمجھتے ہیں' حالانکہ یہ آپ کی دو مختلف کتابیں ہیں۔ مسند دو جلدوں میں مطبوع ہے۔ امام ذہبی نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے:

" له كتابان كبيران نفيسان : المسند والمُصنّف "

یعنی آپ کی مسند اور مصنف دو بڑی اعلیٰ اور ضخیم کتابیں ہیں۔

(۳) **التفسير** (۴) **التاريخ**

(۵) **الايمان:** یہ علامہ البانی کی تحقیق سے چھپ چکی ہے۔ اور اس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

(۶) **الاوائل** (۷) **ثواب القرآن** (۸) **السُّنّة:** اس کا ذکر ابن تیمیہ نے بھی کیا ہے۔

(۹) **المغازى** (۱۰) **الفتن** (۱۱) **الفتوح**

ان کے علاوہ بھی آپ کی کئی اور تصانیف ہیں۔

**وفات:** آپ کے بارے میں لکھنے والوں کا آپ کی تاریخ وفات پر اتفاق ہے کہ آپ محرم ۲۳۵ھ میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ خطیب بغدادی نے تو صراحتاً لکھا ہے:

" توفى وقت العشاء الآخرة 'ليلة الخميس لثمان مضت من المحرم 'سنة خمس وثلاثين ومائتين"

''جمعرات کی رات' عشاء کے وقت ۸ محرم الحرام ۲۳۵ھ میں وفات ہوئی۔''

وقال البخارى ومطين : مات أبو بكر فى المحرم سنة خمس وثلاثين ومائتين۔

''امام بخاری اور مطین نے کہا ہے کہ ابوبکر کی وفات محرم الحرام ۲۳۵ھ میں ہوئی۔''

# کچھ کتاب کے بارے میں

## ☆اسم الکتاب

آپ کی مشہورِ زمانہ کتاب اس نام سے طبع ہوئی ہے: **المُصنّف فی الأحادیث والآثار**

جنہوں نے بھی آپ کا ترجمہ لکھا ہے آپ کی کتاب کو مصنف کے نام سے ذکر کیا ہے اور تراجم، تاریخ و مرویات کی کتب میں بھی یہی نام لکھا ملتا ہے اور مطبوعہ کتاب پر بھی یہی نام درج ہے۔ مگر بعض مقامات پر تھوڑا بہت اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً خطیب بغدادی نے اسے '**الاحکام**' کہا ہے اور ان کی دیکھا دیکھی داؤدی اسماعیل پاشا، عمر رضا اور دیگر معاصرین نے بھی اسے '**الاحکام**' کہا ہے، مگر بالجزم اس نام کی کتاب کی نسبت ان کی طرف نہیں کی۔

ابن ندیم نے اپنی فہرست میں اسے '**السُّنن**' کہا ہے۔ مذکورہ بالا لوگوں نے اسے سنن بھی کہا ہے مگر یقینی طور پر انہوں نے بھی اسے آپ کی طرف منسوب نہیں کیا۔ یاد رہے کہ ان میں سے بعض نے '**الاحکام**' کا ذکر کیا ہے اور بعض نے '**السُّنن**' کا اور بعض نے ان دونوں کا اور بعض نے **المُصنّف الاحکام** اور **السُّنن** تین کتابیں شمار کی ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ محقق مؤرخین نے ان تینوں میں سے ایک نام لکھا ہے، اسے تین کتابیں نہیں سمجھا۔ یا 'مصنف' لکھا ہے یا 'الاحکام' یا 'السنن'۔ جس نے ان میں سے کسی دو کو یا تین کو جمع کیا اسے وہم ہوا۔ خطیب بغدادیؒ نے ان کی کتب کے نام لکھتے ہوئے 'الاحکام' کا ذکر کیا ہے اور 'مصنف' کا ذکر نہیں کیا۔ کیا خطیب بغدادیؒ سے اتنی بڑی کتاب پوشیدہ رہ سکتی ہے! بلکہ ذہبی اور ابن ھادی نے خطیب کی عبارت نقل کرتے ہوئے صرف مصنف کا ذکر کیا ہے۔ امام ذہبی نے اپنی دیگر کتب میں بھی صرف مصنف ہی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ابن ندیم نے بھی جہاں آپ کی السنن کا ذکر کیا ہے وہاں المصنف کا ذکر نہیں کیا اور جہاں المصنف لکھا ہے وہاں السنن کا تذکرہ نہیں کیا۔

## اختلاف کی وجوہ

کتاب کے نام میں اس طرح کے اختلاف کی درج ذیل وجوہ ہوسکتی ہیں:

(۱) ابن ابی شیبہ نے متقدمین کے طریقے کے مطابق اپنی کتاب کا کوئی نام رکھا ہی نہ ہو اور بعد میں آپ کی کتاب مصنف کے نام مشہور ہوگئی اور اسی نام کا اس پر اطلاق شروع ہوگیا۔

(۲) متقدمین علماء بعض کتابوں کے نام معنی کو دیکھ کر رکھ لیا کرتے تھے اور اس میں تھوڑا بہت اختلاف بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی کئی ایک مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے:

☆ سنن دارمی ہے، اسے 'مسند الدارمی' بھی کہا جاتا ہے۔

☆ سنن سعید بن منصور ہے۔ اسے مصنف سعید بن منصور بھی کہتے ہیں۔

☆ قاسم بن اصبغ کی '**المُنتقٰی**' ہے۔ اسے '**المُصنّف**' بھی کہا جاتا ہے۔

☆امام طحاوی کی 'شرح معانی الآثار' ہے۔ اسے 'شرح المعانی' یا 'معانی الآثار' بھی کہتے ہیں' بلکہ اسے 'المُصنّف' بھی کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی ایسی کئی ایک مثالیں موجود ہیں جن میں ایک ہی کتاب کو اس کے مضامین کا اعتبار کرتے ہوئے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی 'مصنف ابن ابی شیبہ' کے بارے میں ہے۔ کسی نے اسے 'الاحکام' کہا' کسی نے اسے 'السنن' کہہ دیا اور کوئی اسے 'المصنف' کے نام سے یاد رکھتا ہے' البتہ اسے تین مختلف کتابیں شمار کرنا وہم کے علاوہ کچھ نہیں۔

ابن قدامہؒ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب 'المُغنی' میں ایک جگہ مصنف ابن ابی شیبہ کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''أخرجه ابن أبی شیبة فی سننه'' کہ اسے ابن ابی شیبہ نے اپنی سنن میں درج کیا ہے۔ ابن قدامہ کے بھتیجے نے بھی شرح الکبیر میں بھی مغنی کی عبارت نقل کرتے ہوئے بغیر کسی تبدّل وتغیّر کے یہی لکھا ہے اور اس سنن سے ان کی مراد مصنف ابن ابی شیبہ ہی ہے۔

ان جیسی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ علماء میں کتاب کا نام 'المُصنّف' معروف ہے اگرچہ بعض لوگوں نے اسے دوسرے ناموں سے بھی درج کیا ہے۔ آپ کی یہ کتاب صحیح سند کے ساتھ آپ تک مروی ہے اور ثابت ہے۔ اور یہ قدیم طریقے کے نسخے کے مطابق مدوّن ہے۔ تاریخ وتراجم اور مرویات کی کتب میں اسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ علماء اور طلبۂ علم نے مرورِ زمانہ کے باوجود اس کا کوئی اور نام پسند نہیں کیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر 'الاحکام' یا 'السنن' بول کر اس سے 'المصنف' کے علاوہ کوئی اور کتاب مراد لی گئی ہو تو اس کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔

## کتاب کی مؤلّف کی طرف نسبت

کتاب کی نسبت مؤلف کی طرف درست اور صحیح طور پر ثابت ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) کتاب کے تمام نسخوں میں اس کی نسبت امام ابن ابی شیبہ ہی کی طرف کی گئی ہے' بلکہ بعض نسخوں میں مؤلف کی مزید تعریف بھی کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ آپ شیخ المشائخ ہیں' امام بخاری' مسلم' ابوداؤد وغیرہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ بعض نسخوں میں ایسی عبارات لکھی ہیں جو اس کتاب کی منزلت ومرتبے کو مزید بڑھاتی ہیں۔

(۲) بہت سی اسناد کے ذریعے اس کتاب کی نسبت امام ابن ابی شیبہ کی طرف ثابت ہے۔

(۳) جس کسی نے بھی امام ابن ابی شیبہ کا ترجمہ لکھا ہے اس نے اس کتاب کو آپ کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے 'مصنف' کے نام سے اور کسی نے 'الاحکام' کے نام سے اور کسی نے 'السنن' کے نام سے اس کتاب کو آپ کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۴) علماء نے آپ کی کتاب سے احادیث نقل کی ہیں اور انہیں آپ ہی کی طرف منسوب کیا ہے۔ یعنی 'اخرجه ابن ابی شیبة'۔

(۵) کسی ایک عالم نے بھی اس کتاب کی آپ کی طرف نسبت کو غلط نہیں کہا اور نہ ہی اس کی نفی کی ہے۔

(۶) اس کتاب کی آپ کی طرف نسبت اس قدر مشہور ہے کہ لوگوں نے ابوشیبہ کے دیگر بیٹوں سے امام صاحب کو ممتاز کرنے کے لیے انھیں 'صاحب المصنف' کہنا شروع کر دیا۔ یعنی اس کتاب کی وجہ سے ابوبکر اپنے بھائیوں سے الگ ایک پہچان رکھتے ہیں۔

کتب کی فہرستیں لکھنے والوں نے اس کتاب کی آپ کی طرف نسبت صراحتاً کی ہے۔ ان نسبت کرنے والوں میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں۔

حاجی خلیفہ نے اپنی کتاب **کشف الظنون** (رقم ۲۷۱۱) میں

الکتانی نے اپنی کتاب **الرسالة المستطرفة** (صفحہ ۴۰) میں

فواد سزگین نے اپنی کتاب **تاریخ التراث العربی** (رقم ۱۹۶) میں

حافظ ذہبی نے اپنی کتاب **تذکرة الحفاظ** (۱۰۵۹/۳) اور **سیر الأعلام** (۱۲۲/۱۱) میں

اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کئی ایک مقامات پر اور اسی طرح **تلخیص الحبیر** میں مختلف جگہوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔

## کتاب کا موضوع

مصنف ابن ابی شیبہ کا موضوع وہی ہے جو عام مصنفات کا ہوتا ہے۔ یعنی اس میں صحابہ پر موقوف اثرات' تابعین یا تبع تابعین یا ان کے بعد آنے والے فقہاء کے آثار درج کیے جاتے ہیں' جنہیں مقطوعات کا نام دیا جاتا ہے' اور ان کے اقوال مع سند لکھے جاتے ہیں۔ ان آثار کا اصل موضوع فقہ واحکام ہوتے ہیں' اگرچہ بعض اوقات ان میں عقائد' رقائق' تاریخ' فضائل' ردود وغیرہ پر بھی ابواب بندی کر دی جاتی ہے' پھر ان تمام آثار کو مرتب شکل میں کتب اور ابواب کے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے اور ہر باب میں کوئی ایک یا کئی ایک مرفوع احادیث نقل کی جاتی ہیں۔

ان مصنفات میں صرف فقہی اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیاتِ احکام کی تفسیر میں ان اقوال میں اختلاف ہوتا ہے۔ البتہ تفسیر میں صحابہ وتابعین کے تمام کے تمام اقوال نہیں لکھے جاتے' اس لیے کہ مصنفات کا موضوع کتب تفسیر سے مختلف ہوتا ہے۔

ان میں احکام کے علاوہ جو کچھ نقل کیا جاتا ہے تو اصل یہ ہے کہ زہد ورقائق' تاریخ وفضائل اور فتن وغیرہ پر بحث نہ کی جائے' مگر مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آپ کے تلامذہ میں سے کسی نے یہ سب کچھ جمع کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ احکام کے علاوہ تمام کے تمام موضوعات ضروری نہیں ہیں کہ انہیں مصنفات میں داخل کیا جائے' بلکہ ان کی الگ کتب ہوتی ہیں۔ البتہ ان موضوعات کو کچھ مصنفین اپنی مصنفات میں درج کر دیتے ہیں۔

## مصنف ابن ابی شیبہ کا دیگر سنن کے ساتھ موازنہ

رامہرمزی فرماتے ہیں:

''کوفہ میں صرف ابوبکر ابن ابی شیبہ ہی ہیں جنہوں نے اپنی کتاب میں بکثرت ابواب بنائے ہیں اور انہیں

بہترین اور اچھی ترتیب میں نقل کیا ہے۔''(۱۲)

ابن شاکر الکتبی لکھتے ہیں:

''ابن سید الناس کے پاس بہترین کتب کا ذخیرہ اور عمدہ امہات الکتب موجود ہیں' جن میں سے ایک مصنف ابن ابی شیبہ ہے.....''

ابن شاکر نے مصنف ابن ابی شیبہ کی تعریف کی ہے اور اس کتاب کا ابن سید الناس کے ذخیرۂ کتب میں ہونا ایک خوبی شمار کیا ہے۔

اسی طرح علامہ سبکی نے بھی 'طبقات الشافعیة الکبریٰ' کے اندر 'قفال شاشی' کے ترجمہ میں کہا ہے کہ میں نے اس مسئلہ میں سلف کے اقوال دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے پتہ چلا کہ سلف کے اقوال ذکر کرنے میں سب سے بہترین کتاب مصنف ابن ابی شیبہ ہے۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں اقوال سلف کا ایک ذخیرہ جمع ہے۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:

" صاحب المصنف الذی لم یصنف أحد مثله قط لا قبله و لا بعده "

''ابن ابی شیبہ 'مصنف ابن ابی شیبہ' کے مؤلف ہیں اور اس جیسی کتاب نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کسی نے تالیف کی ہے۔''

جو کبار علماء اس کتاب کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں انہی میں سے خزرجی بھی ہیں۔ ابن ابی شیبہ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں:

"أحد الأعلام و صاحب المصنف"۔ وقال الداودی : "صاحب المسند و المصنف"

''چند کبار علمائے حدیث میں سے ہیں اور مصنف ابن ابی شیبہ کے مؤلف ہیں۔ داؤدی نے کہا کہ آپ صاحبِ 'مسند' اور 'مصنف' ہیں۔''

اسی طرح علامہ سخاوی نے طلبہ حدیث کو وصیت کی ہے کہ وہ فقہی ابواب پر مشتمل کتب پڑھا کریں کیوں کہ اس کی ضرورت ہے اور پھر ان کتب میں 'مصنف ابن ابی شیبہ' کا ذکر کیا ہے۔

علامہ سخاوی کے کلام میں ضرورت سے مراد معرفتِ حلال وحرام کی ضرورت اور آیات واحادیثِ احکام کی تفصیل معلوم ہونے کی ضرورت ہے۔

علامہ سیوطی' حاجی خلیفہ اور کتانی وغیرہ سب نے اپنے اپنے انداز میں مصنف ابن ابی شیبہ کی تعریف کی ہے اور اسے احادیث اور اقوالِ صحابہ وتابعین کے ایک بڑے ذخیرے پر مشتمل کتاب قرار دیا ہے۔

علامہ محمد شفیع تھانویؒ نے بھی ابراہیم نخعی کے اقوال کی تخریج میں اسی کتاب پر اعتماد کیا ہے اور آثار کی تخریج میں ان کا یہ اعتماد 'اعلاء السنن' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

## منہج ابن ابی شیبہ فی مصنفہ

(۱) مؤلف نے اس کتاب کو فقہی ترتیب میں لکھا ہے اور اسے کئی کتب میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ہر کتاب کے تحت

کئی ابواب بنائے ہیں اور ہر باب کے تحت بہت سی نصوص کو جمع کیا ہے۔ باب کے تحت ذکر کردہ احادیث وآثار میں کسی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا۔ بعض اوقات باب کے شروع میں کسی مرفوع حدیث کو لاتے ہیں اور پھر صحابہ وتابعین کے اقوال درج کرتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باب کے شروع میں کسی تابعی کا قول نقل کرتے ہیں اور پھر صحابہ کے اقوال اور اس کے بعد احادیث وغیرہ درج کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ احادیث وآثار کے درج کرنے میں کسی قسم کا کوئی زمانی لحاظ نہیں ہوتا' جس طرح سے احادیث واقوال ذہن میں آئیں درج کر دیتے ہیں۔

(۲) مؤلف نے کوشش کی ہے کہ عنوانِ باب سے تعلق اور مطابقت رکھنے والی مرفوع یا مقطوع روایات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر دیا جائے اور اس سلسلہ میں مؤلف نے صحت وضعف کی پروا نہیں کی' سوائے اس کے کہ اس روایت کا من گھڑت ہونا بالکل واضح ہو۔

(۳) مصنف کا بہت بڑا حصہ اس کے ابواب پر مشتمل ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایک فقہی قول پر الگ سے باب قائم کیا ہے۔ مثلاً کتاب الطہارۃ میں ایک باب اس طرح ہے: ''من کان یری المسح علی العمامة'' اور پھر اس کے بعد یوں عنوان قائم کیا ہے: ''من کان لا یری المسح علیها و یمسح علی رأسه ''(۱۳)

(۴) اسی طرح کتاب الصلوٰۃ میں ایک عنوان یوں قائم کیا ہے: '' التسلیم فی السجدة اذا قرأها الرجل'' اور پھر اس کے بعد اس طرح سے باب قائم کیا ہے: ''من کان لا یسلم من السجدة ''(۱۴) ان کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ کثرت کے ساتھ عنوان قائم کرنے کی وجہ سے اس کتاب میں ابواب کی ایک بڑی تعداد موجود ہے' جو ۵۴۹۴ تک جا پہنچتی ہے۔ یقیناً یہ ابن ابی شیبہ کی فقاہت وعلم پر دلالت کرنے والی چیز ہے۔ جس طرح امام بخاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''فقه البخاری فی تراجمِ أبوابه'' اسی طرح ان کے بارے میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے' مگر ان کی ابواب کی ترتیب کچھ اچھی اور برمحل نہیں ہے۔ مثلاً طہارت یا صیام کے ابواب آپ نے 'کتاب الصلوٰۃ' میں درج کیے ہیں۔ اس وجہ سے اس کتاب میں سے باب تلاش کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہے' کیوں کہ ایک عنوان جس جگہ ہونا چاہئے تھا بعض اوقات وہاں وہ ملتا ہی نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اس کتاب کی تنقیح نہیں کی اور نہ انہیں اسے مرتب کرنے کا موقع ملا' بلکہ شاگردوں کو املا کروائی گئی اور پھر اسی طرح سے لوگوں میں مشہور ہوگئی۔

(۵) اکثر اوقات عنوان قائم کرتے ہوئے باب کا لفظ استعمال نہیں کرتے جیسا کہ دیگر محدثین باب کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے عناوین اس طرح سے ہوتے ہیں: 'فی کذا...' یا 'ما جاء فی کذا...'(۱۵) اور کبھی کبھی لفظ 'باب' اور عنوان کو اکٹھا بھی لکھ دیتے ہیں' مثلاً: 'باب فی کذا...' یا 'باب ما جاء فی کذا...'۔ پوری کتاب میں تقریباً پچیس (۲۵) مواقع پر انہوں نے ایسا کیا ہے۔ کبھی کبھار صرف 'باب' لکھ دیتے ہیں اور اس کا عنوان ذکر نہیں کرتے' جیسا کہ امام بخاری بھی اکثر اس طرح کرتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے صرف تین (۳) جگہوں پر کیا ہے۔ کبھی عنوان میں آیت مبارکہ ذکر کرتے ہیں جس پر مسئلہ کا دارومدار ہوتا ہے۔ مثلاً 'کتاب الطهارة' میں لکھتے ہیں: '' قوله ﴿اَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ ''(۱۶)

اسی طرح 'کتاب الصلوٰۃ' میں ایک مقام پر یوں عنوان قائم کرتے ہیں: ''فی قوله تعالی ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ ''۔ بعض اوقات عنوان میں کسی حدیث کا کوئی ٹکڑا نقل کرتے ہیں' مثلاً 'کتاب الصلوٰۃ' میں ایک باب اس طرح قائم کیا ہے: ''صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم''(۱۷) اسی طرح 'کتاب الصید' میں ایک باب یوں قائم کرتے ہیں: ''الملائكة لا تدخل بيتًا فيه كلب''(۱۸) بعض اوقات صیغہ استفہام کے ساتھ باب قائم کرتے ہیں۔ مثلاً 'کتاب الطهارة' میں ہے ''فی الوضوء كم هو مرة؟''(۱۹)

(۶) اسناد نقل کرنے میں ابن ابی شیبہ درج ذیل باتیں بھی پیش نظر رکھتے ہیں:

(ا) راوی اور شیخ کے مابین صیغ ادا کو مدّنظر رکھتے ہوئے انہیں نقل بھی کر دیتے ہیں' مثلاً آپ نے لکھا ہے: "حدثنا أبو معاوية وابن نمير عن الأعمش عن المنهال عن زاذان عن البراء قال..." اس کے بعد آخر میں کہتے ہیں: "الا أن ابن نمير قال حدثنا الاعمش قال حدثنا المنهال..." یعنی ابومعاویہ نے 'عن الأعمش' کہا ہے اور ابن نمیر نے 'حدثنا الأعمش' کہا ہے۔(۲۰)

ایک اور حدیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حدثنا وكيع وأبو معاوية عن الأعمش قال سمعت مجاهدًا يحدث عن طاؤس عن ابن عباس..." اور پھر آخر میں کہتے ہیں: "و لم يقل أبو معاوية سمعت مجاهدًا" یعنی اس حدیث کی سند میں وکیع نے تو 'سمعت مجاهدا' کے لفظ استعمال کیے ہیں مگر ابومعاویہ نے 'سمعت مجاهدا' نہیں کہا۔(۲۱)

(ب) راویوں کی طرف سے سند کے اندر جو کمی بیشی ہوئی ہو اس پر امام صاحب تنبیہ فرما دیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ اس طرح حدیث شروع کی ہے: "حدثنا معاوية و وكيع عن الأعمش عن ثمامة بن عقبة المحملي عن الحارث بن سويد قال :قال عبد الله ..." اس کے بعد آخر میں کہا ہے: "الا أن أبا معاوية زاد فيه :قال الأعمش فذكرته لابراهيم فحدث عن عبد الله بمثله و زاد فيه :من شر الجن و الانس"(۲۲)

(ج) حدیث کے مرفوع و موقوف ہونے پر بھی آپ تنبیہ فرما دیتے ہیں۔ مثلاً 'کتاب الفتن' میں لکھتے ہیں:
"حدثنا عبد الأعلى وعبيدة بن حميد عن داؤد عن أبي عثمان عن سعد رفعه عبيدة ولم يرفعه عبد الأعلى قال..."

(د) روایت میں اگر کہیں کسی راوی سے کوئی شک ہوا ہو تو اسے بھی واضح کر دیتے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں:
"حدثنا هشيم عن العلاء بن زياد عن الحسن أو غيره الشك مني أن أصحاب رسول الله ﷺ..."

(ہ) حدیث کے مرفوع و موقوف ہونے کو مختلف صیغ سے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً 'رفعه' 'يبلغ به' 'رواية' وغیرہ۔

(۷) بعض اوقات امام ابن ابی شیبہ حدیث کو بالمعنی نقل کر دیتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ کچھ ہی دیر بعد وہی حدیث مفصّل لکھ دیتے ہیں یا پہلے مفصّل لکھ دی ہوتی ہے اور بعد میں اختصار کرتے ہوئے بالمعنی

# تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام کتاب : میزانِ عمرِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

مصنف : بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر

ضخامت:120 صفحات قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: ☆ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ لاہور، پنڈی، کراچی۔ ☆ کتاب سرائے، اردو بازار، لاہور

علمائے اُمت کے ہاں یہ معروف ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت ۶ سال تھی اور ان کی رخصتی ۹ سال کی عمر میں ہوئی۔ اس کی تائید میں بخاری شریف اور دیگر کتبِ احادیث کی روایات پیش کی جاتی ہیں اور یہ عقیدہ پروان چڑھتا ہے کہ نابالغ بچی کا نکاح بھی ہوسکتا ہے اور رخصتی بھی۔ ''میزانِ عمرِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا'' کے مصنف کے نزدیک یہ درست نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خود بخاری کی اس سلسلہ کی روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے اور حتمی طور پر اس سے سیدہ عائشہؓ کا نکاح بعمر چھ سال ثابت نہیں ہوتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عمرِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ان روایات کو بنیاد بنانا درست نہیں۔ اپنے موقف کی تائید میں وہ بہت سے دلائل دیتے ہیں۔ وہ تاریخی حوالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے وقت سیدہ عائشہؓ ۱۹ سالہ بالغہ دوشیزہ تھیں۔

مترجمین اور مفسرین نے سورۃ الطلاق کی آیت ۴ کے الفاظ لَمْ یَحِضْنَ کا معنی یہ کیا ہے کہ ایسی لڑکی جس کو ابھی حیض نہ آیا ہو، یعنی کم عمر نابالغ لڑکی۔ چونکہ یہاں ایسی لڑکی کی عدت کا ذکر ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا نکاح ہوگا تب ہی تو شوہر کی وفات یا طلاق کی صورت میں عدت ہوگی۔ مگر مصنف کتاب ہٰذا لم یحضن کا معنی یہ کرتے ہیں کہ وہ لڑکی جو بالغ ہو مگر کسی عارضے کی بنا پر اسے حیض نہ آتا ہو۔ اپنے موقف کی تائید میں وہ بخاری کی روایت کے راوی ہشام بن عروہ جو حضرت عائشہ کی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پوتے تھے، کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ عمر کے آخری حصے میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر بینائی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ امام مالک ہشام بن عروہ کو دروغ گو قرار دیتے ہیں، لہٰذا ان کی روایت قابل اعتبار نہیں۔ مصنف عمر عائشہؓ کے متعلق تمام روایات کو وضعی کہتے ہیں جو کسی دشمن نے اُم المؤمنین کی قدر و منزلت کو کم کرنے کے لیے بیان کیں۔ مصنف نے دیگر بہت سے دلائل کے ساتھ نابالغ بچی کے نکاح کو عقلِ سلیم اور دینِ فطرت کے بھی خلاف کہا ہے، جبکہ اسلام کے تمام احکام فطری تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔

یہ کتاب علمائے اُمت کے پڑھنے کے لائق ہے تاکہ وہ فریقین کے دلائل کا علمی اور فکری جائزہ لے کر عوام الناس پر حق بات واضح کریں۔

# (۲)

نام کتاب : قرآنی سورتوں کا نظمِ جلی

مصنف : خلیل الرحمٰن چشتی

ضخامت : بڑے سائز کے ۶۸۷ صفحات قیمت: 700 روپے

ملنے کا پتہ : ☆خلیل الرحمٰن چشتی E-11/4 اسلام آباد۔☆ادارہ منشورات اسلامی۔ بالمقابل منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

خلیل الرحمٰن چشتی ان اہلِ علم حضرات میں سے ہیں جنہیں قرآن وحدیث کی تفہیم کے سلسلہ میں حظ وافر عطا ہوا ہے۔ وہ چند بیش قیمت کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں قواعد زبانِ قرآن، حدیث کی اہمیت اور ضرورت اور درس قرآن کی تیاری کیسے؟ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی تمام تصانیف کا مرکز ومحور بس فہمِ قرآن ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی ہے کہ ہر مسلمان اپنے اوقات کا کچھ حصہ ضرور قرآن وحدیث کی تفہیم میں لگائے تاکہ اسے منشائے خداوندی سے آگاہی ہو۔ قرآن وحدیث کی تعلیمات سمجھنے کے لیے عربی کا جاننا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی کتاب ''قواعد زبانِ قرآن'' میرے علم کی حد تک اس وقت مفید ترین کتابوں میں سے ایک ہے، جس میں قرآن کی عربی کا فہم حاصل کرنے کے لیے ہر چیز بہترین انداز میں موجود ہے۔

''قرآنی سورتوں کا نظمِ جلی'' چشتی صاحب کی تازہ ترین تصنیف ہے جو ان کی سالہا سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ قرآن فہمی میں سہولت پیدا کرنے میں یہ نادر کتاب ہے۔ اس میں ہر سورت کا زمانۂ نزول بتایا گیا ہے جس سے قاری کے سامنے وہ ماحول اور حالات آجاتے ہیں جن میں وہ آیات نازل ہوئیں۔ اُس وقت کے حالات سامنے ہوں تو آیات کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ پھر ہر سورت کا اگلی اور پچھلی سورت سے ربط بیان کیا گیا ہے۔ سورتوں کے درمیان اس ربط کا علم بھی تفہیم آیات میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ ہر سورت کے اہم اور کلیدی مضامین کا خلاصہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ نیز سورت کے مضامین کا تجزیہ بڑی محنت اور کوشش سے پیراگراف بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس نادر کتاب کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ محض ترجمے کی مدد سے قرآن کا گہرا فہم حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مصنف نے اس کتاب کے ذریعے اللہ کے کلام کو سمجھنے کا طریقہ بھی تجویز کر دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قاری دورانِ تلاوت اہم الفاظ کو نشان زد کرلے، مرکزی آیات کو high light کرلے، حاشیہ میں سورت کے ہر پیراگراف کا ذیلی عنوان اور موضوع لکھ لے اور پھر اس سورت کو بار بار پڑھے۔ اس طرح پڑھنے سے قاری خود محسوس کرلے گا کہ اسے فہمِ قرآن کے ساتھ ضروری اور خصوصی نسبت حاصل ہوگئی ہے۔

مصنّف نے بڑی محنت کے ساتھ تفہیمِ آیات کو آسان بنانے کے لیے خاکے تیار کیے ہیں جن میں ہر سورت کے پیراگرافس کی تفصیل، مرکزی مضمون اور خلاصہ درج کر دیا گیا ہے۔ الغرض قرآن فہمی کے لیے مصنف کی یہ کوشش انتہائی قابلِ قدر اور مفید ہے۔ قرآن مجید کی تفہیم کا ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ نادر تحفہ ہے۔

# ISLAM: DEEN, NOT RELIGION

**Dr. Ahmad Afzaal**

The essence of true and authentic Islamic thought consists of the idea that it is not enough to practice Islam in the personal life only, but that the teachings of the Quran and those of the Sunnah need also be implemented in their totality in the social, economic, and political fields. In other words, it implies the establishment of the sovereignty of Almighty Allah (SWT) in the "religious" as well as the "secular" domains, or the removal of the dichotomy between collective life and state authority on the one hand and Divine guidance on the other. The underlying and pervasive idea in this context, which is also an integral part of the Islamic Revolutionary Thought, is that the struggle to establish unqualified and unconditional ascendancy of the Holy Qur'an and the Sunnah of Prophet Muhammad (SAAWS) is obligatory upon all members of the Muslim Ummah. The goal of this struggle is to achieve the domination of the True way of life (Deen al-Haq), so that the Islamic System of Social Justice - which is the most balanced synthesis of human freedom, fraternity, and equality, and which embodies the Divine attributes of Benevolence, Providence, and Justice - can be established on God's earth.

The Islamic Revolutionary Thought, briefly defined above, is often condemned and denigrated by the Western media as one of the most despised evils in today's world, the notorious "Islamic Fundamentalism." The reason for their extreme aversion is based on the fact that it is only Islam and its revolutionary and dynamic interpretation that poses a real challenge to secularism - the system of collective life that was born in Europe but which has come to dominate the entire globe.

What is secularism? Any number of religions can be accommodated under a secular system, provided no demand is made regarding the application of religious criteria in defining social, economic, and political policies. The selection of goals and the utilization of means in all collective affairs must not be inspired by any form of religious teaching; rather, such policy decisions should be taken only on the basis of human pragmatic thought and majority opinion. Religion under a secular system is demoted to a personal and private affair of the individual. Thus, everyone is totally free concerning his metaphysical beliefs, rituals for worship, and social customs; the state won't interfere in any of these. At the same time, religion must not intrude or intervene in the running of the state either. Such a concept is, of course, diametrically opposed to the basic teaching of Islam.

The Holy Quran describes Islam as Deen al-Haq, or the true way of life. The very connotation of the word Deen - as contrasted with "religion" - is a declaration of war against secularism. This is because the word religion is commonly used in a rather narrow sense, its scope being limited to a set of dogmas, some rituals for worship, and a number of social customs to celebrate important life-events.

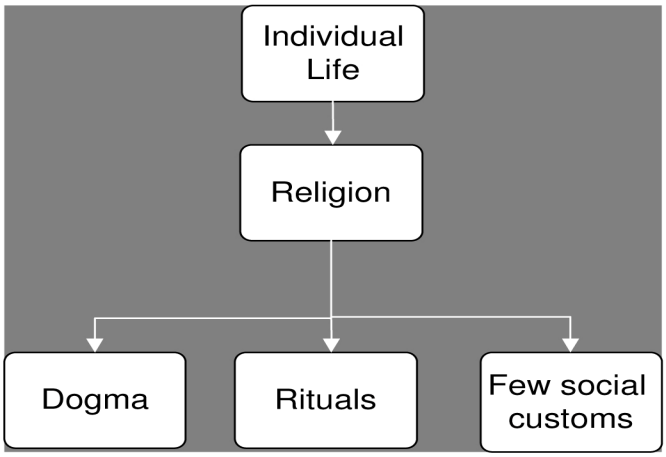


Deen, on the other hand, can be understood through following steps:

The basic definition of Deen is reward. (Al-Fatiha: 3)

↓

Reward is always on the basis of some laws. If anyone abides by the laws, he will be given good reward and in case of their violations, he will be punished.

↓

Laws are there to support a system and the system is known by the one

who has the absolute authority and command.

↓

the value of a system exists till the time it is obeyed.

Hence, Deen is a system of life in which human beings consciously surrender themselves to the sovereignty of a higher authority, and live a life of total obedience under the system of that higher authority, in order to gain rewards from it and to save themselves from its punishment.

If the king has the absolute say and is being obeyed completely then the system is known as Deen al-Malik (Yousuf:76) – King's system.

> *"….He could not take his brother by the **law of the king** (as a slave)…."*

When the term Deen is used for Islam, it obviously means a system of life where Almighty Allah (SWT) is worshipped and obeyed, not just in the narrow religious sense, but in a manner that includes all aspects of human life.

> *"And you see that the people enter **Allâh's Deen** (Islâm) in crowds". (An-Nasr: 2)*

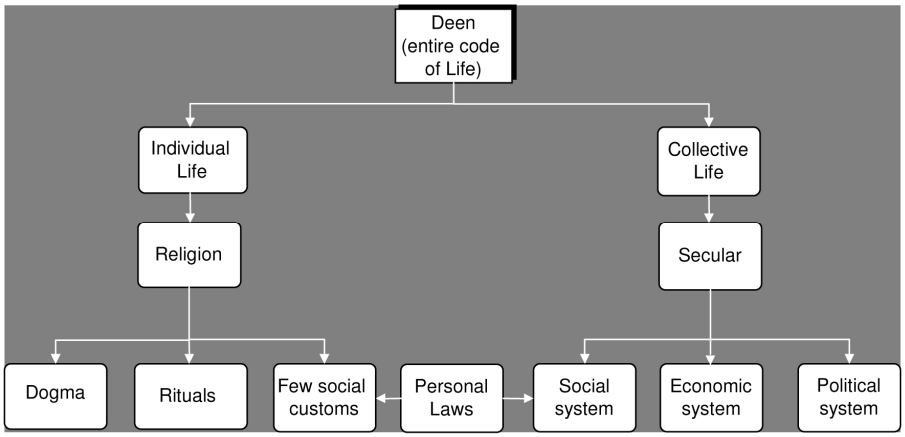


Let us compare secularism with Islamic system. There is no guidance provided by the non-Islamic system at individual level. Whereas, Islam provides complete guidance at individual level, as well as at collective level.

> *"This day, i have perfected your Deen for you, completed my favor upon you, and have chosen for you Islam as your Deen" (5:3)*

Islam is based on, and rooted in, a well-integrated set of beliefs describing the nature of ultimate reality, meaning of human life, and the final destiny. In addition to this essential faith or Iman, modes of worship (i.e., Salat, Zakat, Saum, and Hajj) and various social customs are also indispensable and integral parts of Islam.

The non Islamic system provides popular sovereignty at political level of the collective sphere of life. People are sovereign and can make any laws even if they clash with the divine laws. God has nothing to do with their collective life affairs. This is the first time in the history of mankind that man has taken out God from their collective lives. At economic level, the landmark of secular system is interest based economy in which a person owns everything. A person has free choice to spend/earn money the way he pleases. Interest based economy necessarily creates "haves and have nots". The one who is rich will remain permanently rich and the one who is poor will remain permanently poor. Interest has a sister known as insurance with the help of which it is pretended that Allah is prevented from making the people poor. Through speculation, the economy is in the hands of few people. When ever,

they want, they can suck blood of the masses. Whereas, at social level "freedom" is the catch word of secularism, and total freedom ultimately leads to unwed mothers, single parents and high rate of divorces in the society.

On the other hand, along with religious guidance, Islam also provides us all the relevant instructions regarding our social, economic, and political existence (generally considered to be the "secular" or "worldly" aspects of life), and this is what really distinguishes Islam from other religions, say, Christianity or Buddhism. The salient features of Islamic socio-politico-economic system are

**At political level** (no oppression)

- Sovereignty (al-haakamiyya) belongs to Allah alone and for mankind is khilafat (Yousuf : 40, Bani-Israel : 111, Al-Kahf : 26)
- No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah. (An-Nisa : 59, Al Hujraat : 1)
- No authoritarianism, mutual consultation. (As-Shura : 38)
- Makes a clear distinction between muslims and non-muslims. (At-Tawbah : 29)
- No theocracy. (At-Tawbah : 31)

**At economic level** (no exploitation)

- Allah owns everything (al-malik). (3:180, 63:7)
- Man is only a custodian. (57:7)
- Controlled capitalism minus interest & gambling. (2:275, 2: 279, 5:91)

**At social level** (no discrimination)

- One creator (al-khaliq), everyone (by birth) is equal (4:1, 49:13)
- Segregation of sexes. (24:31, 33:53, 33:59)
- Unity of the human race - common origin of mankind from Adam and Eve,

  Hence total equality between black, white, Arab, non-Arab etc.

**Note:**

"My choice of Mohammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels". by Dr. Michael Hart, the 100: a ranking of the most influential persons in the history. Page 33, 1978 Presently in all existing systems, collective life affairs are based on secularism and divine guidance

has no relevance. This is shirk and in Quranic terms it is known as a system of taghoot (Evil and devil)

"....and they wish to go for judgment to the taghoot (those authorities which govern in violation of Allah's laws) while they have been ordered to reject them..." (4:60)

"...those who do not make decisions according to Allah's laws, are kafir" (5:44)

".... those who do not make decisions according to Allah's laws, are zalim (mushrik)" -(5:45)

"..... those who do not make decisions according to Allah's laws, are fasiq (disobedient") - (5:47)

According to these Quranic decrees, at collective level, the whole Muslim Ummah is kafir, fasiq and musrik (zalim)

The true way of life, Deen al-Haq, is not meant to survive submissively as a mere religion under the umbrella of secularism; instead the Holy Quran makes it abundantly clear that Islam is meant to dominate all domains of life and all man-made systems and ideologies. This puts a tremendous responsibility on our shoulders. The Quranic commands vis-à-vis human society, culture, law, economics, and politics are not given to us so that we may admire and praise them, but they are meant to be implemented and acted upon. This necessitates that the gulf between Faith and Power be removed, which obviously requires a revolution in the leadership so that - instead of fulfilling any un-Islamic agenda - it contributes towards the establishment of "God's Kingdom on earth". Without collective organizational power, a significant portion of Islam remains confined to the realm of theory only, and, as a result, all sorts of corruption, injustice, inequity and immorality are let loose on earth. To establish the Islamic state is not a one man's job. It requires a collective effort and this effort in Quranic terms is known as Jihad-fi-sabeelillah and without jihad-fi-sabeelillah there is no salvation from painful doom as stated in verse (61:10-11)

> *"O believers, shall I tell you, and guide you to a trade which will save you from a painful doom, that you believe in Allah and his messenger (p b u h) and that you strive hard (jihad) in the cause of Allah with your wealth and your lives: that will be better for you, if you but know." (As-Saf: 10-11).*

It's not that Islam cannot survive or support itself without political authority, but, in fact, it is the political authority that grows more and more corrupt unless it is subordinated to the commands of the Holy Quran and the Sunnah of Prophet Muhammad (SAW).

*Continued at page 87*

# MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

## Aal-e-Imran

*(Ayaat 31- 63)*

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱

*(31) Say: "If you do love Allah (SWT) follow me: Allah (SWT) will love you and forgive you your sins for Allah (SWT) is Oft-Forgiving Most Merciful."*

This is an extremely important *ayah*. Allah (SWT) explicates that the love of Allah (SWT), the basis and essence of Islam, is attained by following His Messenger (SAW). A difference must be clarified between obeying the Prophet (SAW) *(Ita'at)* and following the Prophet (SAW) *(Ittiba')*. Obeying means to do whatever the Prophet (SAW) has ordered us to do and abstain from whatever he (SAW) has asked us to refrain from. To follow means to try to copy the day-to-day habits of the Prophet (SAW) out of sheer love for him. This is spiritually higher then merely obeying and this action will make the follower the beloved of Allah (SWT).

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲

*(32) Say: "Obey Allah and His Messenger. But if they turn back then Allah (SWT) does not love those who reject Faith"*

Our foremost relationship with the Holy Prophet (SAW) is to have true faith and belief in his Prophethood. Secondly as the *ayah* indicates, the second relationship with the last Prophet (SAW) is that of obedience. It is incumbent on every Muslim to obey him without question i.e. this obedience must be unconditional as is commanded by Allah (SWT). This *ayah* proves that defying or rejecting Prophet Muhammad (SAW) constitutes disbelief in Islam. Thus *Ita'at* is a fundamental requirement for every Muslim but to attain a higher spiritual level, one should strive for *Ittiba'*.

From here, we begin the second section of this *surah* from *ayah* 33 to 64. It was revealed in 9 A.H when a deputation of scholars from the

Christian state of *Najran*, a city between *Hijaz* and *Yaman*, visited the Prophet (SAW). *Najran* was a Christian city and it was governed by three Christian chiefs who came to visit the Prophet (SAW) accompanied by 60 men. Allah (SWT) sent down the following *ayat* during this period to invite the members of the Christian deputation.

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٣﴾

*(33) Allah did choose Adam and Noah the family of Abraham and the family of Imran above all people.*

The Prophet (SAW) was from the progeny of *Ibrahim* (AS), while *Imran* (AS) [1] was the father of *Musa* (AS) and *Haroon* (AS) from whose lineage was *Maryam* (AS).

ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾

*(34) Offspring one of the other. And Allah (SWT) hears and knows all things.*

i.e. they all had the same lineage. *Imran* was amongst *Ibrahim's* offspring and *'Isa (AS)* and *Yahya (AS)* were from the progeny of *Imran.*

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٥﴾

*(35) Remember! When the wife of Imran said: "O my Lord! I do dedicate unto You what is in my womb for Your special service, so accept this of me for You hear and know all".*

This *ayah* describes the birth of *Maryam* (Mary) (AS), the mother of *'Isa* (AS). The wife of *Imran* i.e. the mother of *Maryam* (AS) supplicated to Allah (SWT) to grant her an offspring and she would dedicate her child to Allah's service. *"So accept this of me for You hear and know all."* i.e. only You hear Your servants and know their intentions.

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٣٦﴾

*(36) When she was delivered of the child she said: "O my Lord! Behold! I have given birth to a daughter". And Allah (SWT) knew best what she brought forth, "and the male is not like the female. I have named her Mary and I commend her and her offspring to Your protection from the Evil one the Rejected."*

She was not expecting a girl to be born and was hoping for a male child, as according to her views, a male child would have served the purpose better for which she had dedicated her child. She named the female child *Maryam* and sought refuge with Allah (SWT) to save her child and her offspring from the evil of Satan.

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۭ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾

*(37) And her Lord graciously accepted her: He made her grow in purity and goodness. She was assigned to the care of Zechariah. Every time that he entered her chamber to see her he found her supplied with sustenance. He said: "O Mary! From where have you gotten this?" She said: "From Allah (SWT); for Allah (SWT) provides sustenance to whom He pleases without measure.*

Allah (SWT) accepted Maryam (AS) as a result of her mother's supplication and made her grow up into a pious and righteous person. Zakariyya (AS) was the maternal uncle of Maryam (AS) and Allah (SWT) assigned him to be her guardian in the temple. "Every time that he entered her chamber to see her he found her supplied with sustenance. He said: "O Mary! From where have you gotten this?" Whenever Zakariyya (AS) entered the praying place of Maryam (AS), he would find with her all kinds of unseasoned fruits. When he saw this, he asked her about these fruits, and she replied, "From Allah (SWT); for Allah (SWT) provides sustenance to whom He pleases without measure."

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿٣٨﴾

*(38) Thereupon Zechariah prayed to his Lord: "O my Lord! Grant me upright descendants; surely You hear all prayers."*

*Zakariyya* (AS) was an old man as was his wife, but when he saw *Maryam* (AS) with all the provision provided to her miraculously by Allah (SWT), he also supplicated to Him to provide him with a righteous child. And surely Allah (SWT) listens to all prayers of His servants.

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٣٩﴾

*(39) While he was standing in prayer in the chamber, the angels called unto him: "Allah gives you glad tidings of John who shall confirm the truth of a Word from Allah. And he will be noble and chaste and a Prophet from among the righteous."*

The angels delivered the good news to *Zakariyya* (AS) while he was supplicating to his Lord that Allah (SWT) is going to bless him with a child, his name will be *Yahya* (AS) (John the Baptist) and he will confirm the *word* of Allah (SWT). *'Isa* (AS) has been described as a *word* of Allah (SWT) in the *Qur'an*, which refers to his birth because he was born at the command of Allah (SWT), when He said: "*Be*".

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿٤٠﴾

*(40) He said: "O my Lord! How shall I have a son seeing I am very old and my wife is barren?" (Allah) said: "Thus Allah (SWT) does what He wills."*

When the angels gave the glad tidings of a child to *Zakariyya* (AS), he was surprised and wondered as to how he could have a child at such an old age and when his wife was also barren. *"(Allah) said: "Thus Allah (SWT) does what He wills.""* i.e. despite your old age and sterility of your wife, Allah (SWT) will bestow upon you a son and He does what He wills.

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

*(41) He said: "O my Lord! Give me a sign!" "Your Sign shall be that you shall not speak to people for three days but with signals. Then celebrate the praises of your Lord again and again and glorify Him in the evening and in the morning."*

*Zakariyya* (AS) asked his Lord for a sign to assure him and his wife of the birth of their child. Therefore Allah (SWT) gave him a sign that he would not be able to speak to people except by sign language for three days and ordered him to glorify and thank Him.

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰي نِسَاۗءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

*(42) And when the angels said: "O Mary! Allah (SWT) has chosen you, purified you and chosen you above the women of all nations.*

In this *ayah*, Allah (SWT) states that He chose *Maryam* (AS) for her virtue and chasteness above women of all nations and has purified her. The Messenger of Allah (SAW) once said: *"Many men achieved perfection, but among women, only Mary the daughter of Imran and Asiah, the wife of Pharaoh, achieved perfection."* [2]

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

*(43) O Mary! Be obedient to your Lord and prostrate yourself and bow down with those who bow down.*

The angels told *Maryam* (AS) to submit herself in obedience, to praise Allah (SWT) and prostrate and bow in front of Him.

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝

*(44) These are the news from the unseen which We are revealing to you. You were not present with them when they cast their pens to decide which of them should be the guardian of Mary (AS); nor were you with them when they argued about it.*

This *ayah* indicates that the Prophets of Allah (SWT) did not know the unseen, unless the knowledge of it was revealed to them by the will of Allah (SWT). *"You were not present with them when they cast their pens to decide which of them should be the guardian of Mary (AS); nor were you with them when they argued about it"* When the mother of

*Maryam* (AS) dedicated her to the service of Allah (SWT) in the temple, the priests and scholars of the temple started to argue amongst themselves as to who shall be the custodian of *Maryam* (AS). Prophet *Zakariyya* (AS) asked them to give her in his custody as he was their chief and also the husband of *Maryam's* maternal aunt, but they did not want to give *Maryam* (AS) to him as each of them wanted to be her guardian himself. Therefore, they decided to cast lots with the pens with which they used to write the *Torah* and in the end Allah (SWT) made Zechariah (AS) win and he took *Maryam* (AS) in his custody.

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾

*(45) Remember when the angels said: "O Mary! Allah gives you the good news with a Word from Him that you will be given a son, his name will be Christ, Jesus, the son of Mary. He will be noble in this world and the Hereafter; and he will be from those who are very close to Allah (SWT).*"

This noble *ayah* contains the glad tidings given to *Maryam* (AS) about the birth of her son '*Isa* (AS). As mentioned earlier in *ayah* 39, the *Word* of Allah (SWT) refers to his birth because he was born at the command of Allah (SWT), when He said: "*Be*". Allah (SWT) refers to *'Isa* (AS) as the son of *Maryam* (AS) because he was born miraculously without any father. *"He will be noble in this world and the Hereafter; and he will be from those who are very close to Allah (SWT)"* i.e. He will be honored by Allah (SWT) in this world and the Hereafter and will be among those who are foremost in faith, virtue and shall be one of the nearest to Him.

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿٤٦﴾

*(46) "He will speak to the people in the cradle and in maturity. And he will be among the righteous."*

This *ayah* states that *Masih* (Jesus) (AS) spoke to the people from his cradle defending his mother when they accused her of being unchaste and he will also speak to them when he reaches his maturity. The Arabic word كَهْلًا *(kahlan)* is translated as maturity or mature age i.e. when a person reaches his full strength or someone who has reached the ripe age. In the *Qur'an*, this word is only used in reference to *Masih* (AS) and to express the prime of manhood. Islamic scholars agree that it denotes the age of 35 or above. They base their views on a *Hadith* reported by *Ibn Abbas* (RA) that *Masih* (AS) was raised up to Allah's presence in his early 30s and that he will live for 40 years when he comes again. [3] Therefore, *'Isa* (AS) has not died yet, Allah (SWT) raised him up unto Himself because the Jews wanted to kill him, and he will descend again at the end of time and rule the earth according to Islam.

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٤٧

*(47) She said: "O my Lord! How shall I have a son when no man has touched me?" He said: "Even so Allah (SWT) creates what He wills; when He has decreed a plan He but says to it `Be' and it is!"*

When the angels gave the glad tidings of a son to *Maryam* (AS), she was surprised as was *Zakariyya* (AS) when he was given the good news of his son, *Yahya* (AS). So she asked as to how she could have a child when no man had ever touched her. In reply, Allah (SWT) says: "*Even so: Allah (SWT) creates what He wills; when He has decreed a plan He but says to it `Be' and it is"* i.e. nothing is beyond His power and whatever He wills comes into existence immediately at the mere utterance of 'Be'.

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝٤٨

*(48) And Allah (SWT) will teach him the Book, wisdom, the Torah and the Injeel.*

i.e. Allah (SWT) will give *Masih* (AS) knowledge and wisdom and he will profess the same religion previously given to *Musa* (AS) along with the knowledge of *Injeel.*

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝٤٩

*(49) And a Messenger to the Children of Israel (saying): I have come to you with a sign from your Lord in that I make for you out of clay as it were the figure of a bird and breathe into it and it becomes a bird by Allah's (SWT) leave; and I heal the blind and the lepers and bring the dead to life by Allah's (SWT) leave. And I inform you what you eat and what you store in your houses. Surely therein is a Sign for you if you believe.*

Allah (SWT) sent *'Isa* (AS) to the *Children of Israel* as His Messenger along with the miracles that he performed by His will. In the previous *ayah,* Allah (SWT) mentions *Yahya* (AS) as His Prophet *(Nabi)* whereas He sent *'Isa* (AS) to the *Children of Israel* as His Messenger *(Rasul).* The *Qur'an* has used these words separately as well as interchangeably. A Prophet *(Nabi)* is an individual who guides his people to Allah's path while a Messenger *(Rasul)* has a special position which is only given to a few of the Prophets. Along with being a deliverer of His Lord's message a Messenger also follows a *shari'ah.* A Prophet may be killed but a Messenger cannot be killed. All the Prophets are not Messengers, yet all the Messengers are by default Prophets. *"Surely therein is a Sign for you if you believe."* i.e. for those who

are believers, these miracles should testify that *'Isa* (AS) was a Messenger of Allah.

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٥٠﴾

(50) *(I have come to you) confirming which was before me of the Torah and to make lawful to you part of what was forbidden to you. I have come to you with a Sign from your Lord. So fear Allah and obey me.*

*'Isa* (AS) had come to confirm the previous teachings of Prophets and Messengers, especially *Musa* (AS), and to make certain things lawful which were forbidden according to the old law. *"I have come to you with a Sign from your Lord. So fear Allah and obey me."* i.e. I have brought the truth from Allah (SWT), so submit yourselves to Him in all obedience and follow me.

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٥١﴾

(51) *Truly, Allah is my Lord and your Lord; so worship Him (alone). This is the straight path.*

The path shown by all the Prophets including *'Isa* (AS) to mankind was to worship Allah (SWT) alone and submit and be loyal to Him.

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٥٢﴾

(52) *When Jesus found disbelief in them he said: "Who will be my helpers to Allah (SWT)?" Said the Disciples: "We are Allah's (SWT) helpers, we believe in Allah (SWT) and bear witness that we are Muslims."*

When *'Isa* (AS) perceived disbelief amongst the Jews and felt that they were not willing to listen to the word of Allah (SWT), he called out to his people as to who would help him in conveying the message of Allah (SWT). *"Said the Disciples: "We are Allah's (SWT) helpers, we believe in Allah (SWT) and bear witness that we are Muslims""* *Hawariyyun* refers to the disciples of *'Isa* (AS) who were a few amongst the *Children of Israel* that believed in him as the true Messenger of Allah (SWT).

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٣﴾

(53) *"Our Lord! We believe in your revelations and we follow the Messenger. So count us among those who bear witness."*

i.e. we follow the *Injeel* which Allah (SWT) revealed to His Messenger, *'Isa* (AS) and bear witness to the truth of His message.

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٥٤﴾

(54) *And they (disbelievers) plotted and planned and Allah planned too and Allah is the best of planners.*

The Jews plotted against *'Isa* (AS) and tried to kill him but Allah (SWT) saved him, raising him up from his house to heaven. Thus Allah (SWT) frustrated their plots and surely He is the best of all planners.

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾

*(55) And (remember) when Allah (SWT) said: "O Jesus! I will take you and raise you to Myself and purify you of those who disbelieve. I will make those who follow you superior to those who reject Faith till the Day of Resurrection, then shall you all return unto Me and I will judge between you of the matters wherein you used to dispute.*

The Arabic word *tawaffi* literally means *'to take'* and *'to receive'* and it is also used in the meaning *'to seize the soul'* in the *Qur'an* as Allah (SWT) says: *"It is He who takes your souls by night"* [4] Here in this *ayah* it refers to the fact that Allah (SWT) has raised *'Isa* (AS) bodily unto the heavens and it is the belief of the Muslims that he will return before the Day of Resurrection. *"I will make those who follow you superior to those who reject Faith till the Day of Resurrection"* Those who follow him are the Muslims as they follow all the Prophets and Messengers in the correct manner and the Jews are the ones who rejected *'Isa* (AS) along with those Christians who changed and distorted the religion given to him. But among them, there were also sincere Christians who followed the true teachings of *'Isa* (AS) and that is why they always had an upper hand on the *Jews*. *"then shall you all return unto Me and I will judge between you of the matters wherein you used to dispute"* i.e. All their disputes about faith and religion will be adjudged by Allah (SWT), when they return to Him.

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٥٦﴾

*(56) As to those who reject faith I will punish them with terrible agony in this world and in the Hereafter nor will they have anyone to help.*

This *ayah* refers to the Jews who rejected *'Isa* (AS) and those Christians who made changes in their religion. Allah (SWT) says that He will punish them in this world and in the Hereafter and they will not be able to defend or protect themselves against His punishment nor will they have any helpers.

وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٥٧﴾

*(57) As to those who believe and do righteousness deeds, Allah (SWT) will pay them their reward in full. And Allah (SWT) does not like the wrongdoers.*

On the other hand, Allah (SWT) mentions the rewards of the believers in the Hereafter because of the righteous acts they used to do in this world.

ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ﴿٥٨﴾

*(58) This what We recite to you is revelation and a Wise reminder.*

i.e. what Allah (SWT) has revealed to Muhammad (SAW) regarding *'Isa* (AS) and his life is the truth and wise admonition and remembrance.

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

*(59) This similitude of Jesus before Allah (SWT) is as that of Adam (AS): He created him from dust then said to him: "Be" and he was.*

This *ayah* addresses the Christians who believed *'Isa* (AS) to be Allah's son or one of the Trinity because of his miraculous birth, as he was created without a father. But then *Adam* (AS) is more entitled to it because he was created without a father or a mother. *'Isa* is like *Adam* in the sight of Allah (SWT). He created him (*Adam*) of dust and then said to him: 'Be', and he was.

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾

*(60) This is the Truth from your Lord, therefore, do not be of those who doubt.*

i.e. what we have explained about *'Isa* (AS) and his life is the truth, therefore do not doubt it.

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

*(61) If anyone disputes in this matter with you now after (full) knowledge has come to you say: "Come! let us gather together our sons and your sons, our women and your women, ourselves and yourselves: then let us earnestly pray and invoke the curse of Allah (SWT) on those who lie!"*

When the Christian deputation from *Najran* came to visit the Prophet (SAW), they argued with him on some matters regarding *'Isa* (AS) and his birth. At that, Allah (SWT) commanded Prophet Muhammad (SAW) to call them to a *Mubahalah* [5] if they did not accept the truth. At this revelation, the Christians decided not to accept the challenge and went back to *Najran*.

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾

*(62) Verily, this is the true narrative and none has to be worshipped but Allah and indeed Allah is the All-Mighty, the All-Wise.*

i.e. whatever has been revealed regarding *'Isa* (AS) is definitely the correct narration *"and none has to be worshipped but Allah"* This *ayah* is condemnation of the Christian believers who worship *'Isa* (AS) and claim that he is Allah's son.

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾

*(63) But if they turn back then surely, Allah (SWT) has full knowledge of those who do mischief.*

i.e. Allah (SWT) has full knowledge of those who even after fully perceiving the truth, deny it and persist in their falsehood and thus create mischief.

From here begins the third section of this *surah* which generally addresses the *People of the Book* i.e. both Christians and Jews. The subject matter of this section is quite similar to the contents of the middle section of *surah Al-Baqarah.*

**End Notes**

[1] Scholars are of the opinion that Imran mentioned in these *ayaat* was the father of *Maryam* (AS) and thus grandfather of *'Isa* (AS). On the other hand, some believe that Imran was the father of *Musa* (AS) and *Haroon* (AS). It is also possible that both opinions are correct and the father of *Maryam* (AS) may have been named Imran after their ancestor.

[2] At-Tabari 6:397. Also recorded in The Six Books (Kutub As-Sitta) with the exception of Sunan of Abu Dawood.

[3] Muhammed Khalil Herras, Fasl al-Maqal fi raf`i `Isa hayyan wa nuzulihi wa qatlihi ad-Dajjal (Cairo: Maktabat As-Sunnah, 1990), 20.

[4] Surah Al-An'aam (6): 60.

[5] A *Mubahalah* is a ceremony announced in order to decisively settle a disputed matter, where each party supplicates to Allah (SWT) for immediate destruction upon themselves if they are wrong.

خ خ خ

*Continued from page 82*

## ISLAM: DEEN, NOT RELIGION

The struggle to establish the domination of Islam is one of our basic, though unfortunately forgotten, duties. The significance of this obligation is underscored by a tradition according to which Prophet Muhammad (SAW) is reported to have said: "If a Muslim dies and he had neither participated in any war for the cause of Almighty Allah (SWT) nor had he a desire to take part in such a war, then he dies in a state of a certain kind of nifaq (i.e., hypocrisy, and not of true faith)." A Muslim whose life is devoid of the Jihad to establish the system of Khilafah, and who lacks the longing and the deep-felt desire to participate in it and to sacrifice his life for this purpose, can certainly be a Muslim in the legal sense of the word but such a person cannot be a Momin in the judgement of Almighty Allah (SWT). This is because true conviction or Iman, although itself a hidden and covert reality, necessarily manifests itself in the form of Jihad for the cause of Almighty Allah (SWT). This, according to the Holy Quran, is what defines a true believer.

> *"They alone are the believers who come to believe in Allah and His messenger and afterwards never doubt, and who strive in the way of Allah with their wealth and their lives. Only they are truthful and sincere." (Al-Hujurat 49:15)*

خ خ خ

ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی معروف کتاب

# قرآن اور علمِ جدید

کا ساتواں ایڈیشن شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے

## کتاب کا موضوع

''قرآن اور علم جدید'' ڈاکٹر صاحب کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو درحقیقت علامہ اقبال کی کتاب ''خطبات'' ہی کے سلسلے کی ایک دوسری کامیاب کاوش ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ناقابل تردید حقائق، دلائل اور مثالوں سے ان تمام فلسفوں اور نظریات کے تار و پود بکھیر دیئے ہیں جن کی بنیاد پر آج تک مختلف ممالک میں نظام ہائے حکومت قائم رہے ہیں۔

☆ عمدہ طباعت ☆ خوبصورت ٹائٹل کور ☆ اعلیٰ جلد بندی

☆ 583 صفحات ☆ قیمت 650 روپے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی درج ذیل تصانیف بھی دستیاب ہیں:

(1) Ideology of the Future — Price: Rs.500/-

(2) The Quran & Modern Knowledge — Price: Rs.500/-

(قرآن اور علم جدید کا انگریزی ترجمہ)

ہول سیلرز، پبلشرز اور بک سیلرز کے لیے خصوصی تعارفی قیمت

ملنے کا پتہ: ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن

K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور، فون: 042-35074598

ڈسٹری بیوٹر: پروگریسو بکس، اردو بازار، لاہور، فون: 042-37352795